معارف

جنوری ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰/روپئے۔ فی شمارہ ۳۰/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپواکر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۷ ماہ جمادی الاول ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۱ء عدد ۱

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

معارف کے اس شمارہ سے اس کی دوسوساتویں جلد کا آغاز ہورہا ہے، صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندوی کے شذرات میں معارف کی زندگی اور اس کے وجود کے استمرار پر کبھی کبھی ان کے قلم سے کلمات شکر کی تراوش ہوتی، ایسا ہی ایک موقع تھا جب ۴۰ء کے جنوری کے شمارہ میں انہوں نے معارف کے چوبیسویں سال کے آغاز پر لکھا کہ یہ مدت کوئی بڑی مدت نہیں مگر ان ہی چوبیس برسوں میں خدا جانے کتنے کاغذ کے پتلے رسالوں کی صورت میں عرصہ وجود میں آئے اور فنا ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہوئے معارف کے اس امتیاز کو بھی بیان کیا کہ اس زندگی میں معارف نے ایک مہینے کے لیے بھی کبھی کوئی ارادی یا جبری تعطیل نہیں منائی، حالانکہ ان چوبیس برسوں میں انقلابات کے کئی طوفان اٹھے، سیاسیات کی کئی آندھیاں آئیں مگر اس پر بھی خدا کا شکر ہے کہ جس راستہ کو سمجھ بوجھ کر ایک دفعہ صحیح مانا، اب تک اسی راستہ پر قدم ہے، دین کی راہ سے علم کی یا یوں کہیے کہ علم کی راہ سے دین کی خدمت زندگی کا پہلا مقصد تھا اور آج بھی ہے، سید صاحب کے ان الفاظ تشکر پر اب اسّی سال گزر چکے ہیں، قریب قریب ایک صدی نے ہندوستان اور تمام عالم میں خدا جانے کتنے انقلابات و تغیرات کا مشاہدہ کیا، نظریات، عقائد، معاشرت، سیاست اور معیشت نے اس عرصہ میں نشیب و فراز، شکست و ریخت بلکہ بود و نابود کے کیسے کیسے مناظر دیکھے، قدرتی جغرافیہ میں بے شک تغیر نہیں آیا لیکن افکار و نظریات اور اس کے زیر اثر قوت و اقتدار کے بحر و بر ادھر سے ادھر ہوگئے، ایسے میں کاغذ کے پتلوں کی کیا بساط کہ وہ وقت کے طوفانوں کے سامنے ٹک سکیں اور وہ بھی اپنے لیے وضع کردہ اصول و ضوابط کی پاسداری اور اہداف و مقاصد کی پاسبانی کے عہد کے ساتھ، لیکن جس طرح اس عہد کو نبھانے کے لیے اس وقت سجدۂ شکر واجب تھا، آج جب کہ دوسوساتویں جلد کا آغاز ہورہا ہے جبینوں کو شکر کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے اسی دِرازی دی کا سہارا ہے۔

شکر کے مقامات تو بے شمار ہیں، معارف کے شذرات ثبوت ہیں کہ اس نے قومی، ملکی اور عالمی مسائل پر اظہار خیال کرنے میں کبھی کوئی کوتاہی نہ کی، دور کیوں جایئے ۲۰۱۹ء کا آغاز جن حالات

میں ہوا وہ شاید آزاد ہندوستان میں اپنی نوعیت میں سب سے الگ تھا، ایک جمہوری ملک میں جہاں آئین اور قانون کی بالادستی کو شعوری طور پر ملک وقوم کے ضمیر وخمیر میں بسایا گیا اور تمام جمہوری اداروں کی تاسیس وتشکیل میں مختلف مذہبوں، زبانوں، علاقوں اور معاشرتی طورطریقوں کی مشترکہ اساس میں غیر مذہبی اقدار کا پاس ولحاظ رکھا گیا اور اس کو نبھانے کی کسی نہ کسی درجہ میں کوششیں بھی کم وبیش ہوتی رہیں، برسراقتدار جماعت کو کبھی حزب مخالف کی شکل میں دیکھا گیا اور عدلیہ وانتظامیہ ومقننہ بھی یکسر یک طرفہ ہونے کے الزام سے بچتی ہی رہیں، ضرور ہے کہ تکثیری رویوں میں ایسا وقتاً فوقتاً ہوتا رہا کہ قانون کے دیے ہوئے اختیارات کمزور ہوتے نظر آئے، تاہم روشن خیال طبقوں کو اپنی رائے کے اظہار میں زیادہ لکنت کی ضرورت پیش نہیں آئی، اخبارات ورسائل اور دیگر ذرائع وابلاغ میں اعتدال و توازن کسی نہ کسی درجہ میں موجود رہا، لیکن ان ہی جمہوری وسائل کے ذریعہ اور ان کی بدولت جب ایک مخصوص نقطہ نظر کی جماعت جمہوریت کی مسند اقتدار پر فائز ہوئی تو روز اول سے اس نے جمہوری نظام کی روح کے برخلاف ایک آمرانہ نظام کو ترجیحی نمونہ کی شکل میں پیش کرنا شروع کیا، جس کا سب سے خطرناک مظہر این۔آر۔سی کے نفاذ کی شکل میں سامنے آیا، اس کے بعد جس طرح جے این یو، جامعہ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ میں جمہوریت کا چہرہ سیاہ کیا گیا، اس کی حقیقت معارف کے سال گذشتہ کے ابتدائی تین چار مہینوں کے شذرات میں دیکھی جاسکتی ہے، درمیان میں اس بلا پر کورونا کی وبا چھا گئی، اس میں جدید قومی ذہنیت کی ایک اور تصویر سامنے آئی کہ سرمایہ داری سے قوت حاصل کرنے والی فسطائیت صرف مذہب ہی نہیں عام محنت کش انسانوں کو بھی برداشت نہیں کرسکتی، مزدوروں اور غریب عوام پر جو گزری وہ شاید آئندہ ہندوستان کی آج کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے سب سے اہم باب کا مواد بن جائے، یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا، اصلاحات کے نام پر اب کسانوں کے لیے وہی رویہ ہے جس نے گذشتہ سال کے اوائل کو ایام نحسات میں بدل دیا تھا، کاش کوئی سمجھا سکے کہ ایام نحسات کا نتیجہ اس دنیا میں اور مابعد کی دنیا میں صرف رسوائی ہے، معارف نے ان حالات کا تجزیہ جس طرح سال گذشتہ کے ابتدائی چار پانچ مہینوں کے شذرات میں کیا اور احتجاج کی صداؤں کو اس نے امید اور آس کی تازہ ہواؤں میں جاں بخش جھونکے اور نئے سورج کی کرنوں میں بدلتے دیکھا، اس کو پھر سے یاد کرنے اور رکھنے کے لیے مدیر معارف محترم ظلی صاحب کے شذرات کو ایک بار پھر پڑھنے کی ضرورت ہے، یہ اس لیے

بھی کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے شکر کا راز بھی عیاں ہوجائے کہ معارف نے جس راستہ کو سمجھ بوجھ کر صحیح مانا، اب تک اسی راستہ پر قائم ہے۔ فللّٰہ الحمد

کرونا کی وبا اور اس کے اثرات بدنے جیسے مصائب پر صبر اور برداشت کی قوت کو بھی فنا کردیا، موت کی حقیقت کب کسی سے چھپی لیکن گذشتہ سال اس حقیقت نے جس طرح خود کو منوایا شاید اس کی مثال مشکل ہی سے ملے، جانے والوں کا ایک سلسلہ ہے جو نہ رکنے والا بن گیا، سیاہی کی جگہ آنسو ہوتے تو شاید نوحے اور مرثیے بھی پورے نہ ہوپاتے، اس شمارہ میں تعزیت کے لیے اب جناب مختار شمیم کا نام ہے، بھوپال کی ایک نہایت شریف، وضع دار شخصیت کی شکل میں مختار شمیم صاحب ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، ان کی ایک کتاب پر تبصرہ دو تین مہینے ہوئے معارف میں آیا تھا، دارالمصنفین بلکہ اردو دنیا سے محبت ہی ان کی زندگی تھی، ان کا غم کم نہ ہوا تھا کہ علامہ شبلی کے پرنواسے جناب وسیم احمد نعمانی بھی اس دنیا کے لیے پرائے ہوگئے، وہ صرف خانوادہ شبلی سے انتساب ہی سے مفتخر نہیں تھے، ان کی سادگی، محبت، فروتنی، خلوص، غم گساری، درد کو بانٹنے اور خوشیوں میں شریک ہونے کی ادائیں ناقابل فراموش ہیں، وہ بنیادی لحاظ سے اسپورٹس مین تھے، صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں انعام پائے ہوئے لیکن ان کا اصل انعام ان کو سیاست کی دنیا میں قانون ساز اسمبلی کے تین بار رکن ہونے اور پھر دو اہم محکموں کے وزیر ہونے کی شکل میں ملا، ان کے جنازہ میں ان کے حلقہ انتخاب کے لوگ جس طرح شامل ہوئے اور مسلم وغیر مسلم جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے، یہ منظر اعظم گڑھ کی سرزمین پر بہت کم دیکھا گیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، یہ سطریں لکھی جاچکی تھیں کہ ترکی کے شیخ یوسف صالح قراجہ ندوی، پاکستان کے مولانا فضل ربی ندوی اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور پھر ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے انتقال کی خبر آگئی، زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ ضرور ہیں، دل کا معاملہ کچھ اور ہے لیکن حقیقتوں کے اعتراف کے سوا چارہ بھی نہیں۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۔

دسمبر کے معارف میں مکتوب پاکستان کے تحت جناب محمد ارشد کا خط شائع ہوا جس میں بعض مشاہیر کے متعلق مقالہ لکھنے کے لیے قلمی تعاون کی بات تھی، افسوس کہ اس خط میں ان کا پتہ رہ گیا تھا، اب ان کا ای میل ایڈریس دیا جارہا ہے: ”arshad571@yahoo.com“۔

مقالات

علامہ سید سلیمان ندوی اور مشاہیر جنوب

ڈاکٹر راہی فدائی

(۲)

علامہ سید سلیمان ندوی کا چوتھا اور آخری سفر جنوب ۱۹۳۷ء میں ہوا تھا، ۱۸۔۱۹/شعبان ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۴۔۲۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جامعہ دارالسلام عمرآباد (ضلع ویلور، ٹمل ناڈو) کا پہلا جلسہ دستار بندی و تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا، اس عظیم الشان جلسے میں علامہ موصوف کو شرکت کی دعوت دی گئی، جامعہ کے معتمد جناب الحاج کا کا محمد اسماعیل صاحب (متوفی ۱۹۵۹ء) فرزند کلاں بانی جامعہ الحاج کا کا محمد عمر صاحب (متوفی ۱۹۲۷ء) علامہ موصوف کے مخلص دوستوں میں تھے اور ان کی علمی و دینی خدمات کی وجہ سے علامہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، جب کا کا محمد اسماعیل صاحب کی دعوت موصول ہوئی تو علامہ نے بہ طیب خاطر اس کو شرف قبولیت بخشا اور عمرآباد تشریف لا کر جامعہ کے فارغ طلبۃ العلوم سے خصوصی خطاب فرمایا، یہ مکمل خطاب ماہنامہ معارف ماہ جنوری ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوا جس کا ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ”علمائے عزیز! اس سے پہلے کہ آپ قوم میں جائیں اور ملک میں پھیلیں، آپ کو اس غلطی سے ہشیار ہو جانا چاہیے اور فرقہ واری کے تنگ دائرے سے نکل کر اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی خیرخواہی میں مصروف ہونا چاہیے، آج ہمارے جو فقہی اختلاف ہیں وہ کم و بیش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے چلے آرہے ہیں، ایک کی نظر میں کوئی پہلو قوی ہے اور دوسرے کی نظر میں کوئی دوسرا، اگر صحابہ کرامؓ اپنے ان اختلافات کے باوجود ”اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ“ کی مثال اور ”کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ“ کا

گراؤنڈ فلور، 2nd، بی۔ کراس، 4th بلاک، H.B.R لے آؤٹ، بنگلور (کرناٹک)۔ 9448166536

نمونہ تھے تو کیا وجہ ہے کہ آج ہم بھی ان کی پیروی میں اپنے تحقیقی اختلافات کے ساتھ کل مل کر مسلمانوں کی ایک متحدہ جماعت نہ بن سکیں اور ”هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ“ کے تنہا خطاب سے اپنے کو مخاطب نہ کریں۔

عزیزو! بظاہر آپ کی طالب علمی کا زمانہ ختم ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی طالب علمی کا زمانہ اب شروع ہوا ہے، اس سے پہلے جو سال بھی آپ نے علم کی تحصیل میں صرف کیے اس کا منشا اپنے اندر علم کی استعداد پیدا اور تحقیق کا سامان فراہم کرنا تھا، آج آپ کو جو سند دی جارہی ہے وہ اس بات کی نہیں ہے کہ آپ کا علم درجہ کمال کو پہنچ گیا جس میں اضافہ کی گنجائش نہیں بلکہ اس بات کی ہے کہ آئندہ حصول کمال اور تحقیق کے معدّات آپ میں پیدا ہو گئے ہیں جن سے اگر آپ کام لیں تو منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں“۔(۳۶)

علامہ موصوف نے جناب کاکا اسماعیل سے مخلصانہ تعلقات کی بنا پر ان کی ہر گزارش اور ان کی ہر علمی خواہش پوری کی ، جب کاکا اسماعیل صاحب کے زیر سرپرستی علامہ شیخ طنطاوی مصری کی ”تفسیر جواہر“ کا ترجمہ اردو حصہ اول مکمل ہوا تو یہ تفسیر علامہ سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف اعظم گڑھ سے طبع کی گئی۔(۳۷) کاکا اسماعیل صاحب نے جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم مولوی یوسف کوکن عمری کو دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں داخل کرنے کی علامہ سے درخواست کی تو علامہ نے بخوشی اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔(۳۸) اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا محمد یوسف کوکن عمری صاحب نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں، جن میں ”خانوادۂ قاضی بدرالدولہ“، ”سیرت ابن تیمیہ“ ”عرب اینڈ پرشین ان کرناٹک (انگریزی) تعلیم یافتہ طبقے میں بے حد مقبول ہوئیں، محترم کاکا اسماعیل صاحب کو قومی اور رفاہی خدمات کا بھی کافی تجربہ تھا، عوامی کاموں میں بھی بڑے شوق وذوق سے شرکت فرماتے تھے، ان کی عمومی خدمات کے مدنظر حکومت نے ۱۹۴۵ء میں ”خان بہادر“ کا خطاب عطا کیا تھا۔(۳۹) ان کے سوانح نگار مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی عمری موصوف کے اوصاف عالیہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”مرحوم (کاکا محمد اسماعیل صاحب) کی علمی اور دینی بصیرت بھی غیر معمولی تھی،

معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ بڑے بڑے اہل علم حضرات بھی آپ کی حیرت انگیز معلومات پر دنگ رہ جاتے تھے، اس کے علاوہ حاضر جوابی اور حاضر دماغی بھی غضب کی تھی، ایک دفعہ گفتگو کے دوران ''عمر لائبریری'' کا ذکر آیا...... اسی اثنا میں ایک بہت بڑے مولانا بھی وہاں پہنچ گئے تھے، موصوف (کاکا اسماعیل صاحب) نے ان سے پوچھا کیا آپ نے اس (فقہ حنفی کی ضخیم کتاب ''المبسوط'' مؤلفہ امام محمد سرخسیؒ) کی پوری جلدوں کا مطالعہ کیا ہے؟ مولانا نے عجیب انداز میں جواب دیا کہ اس کی تمام جلدوں کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے لیے تو عمر خضر چاہیے، اس پر آپ کسی قدر جذباتی لہجے میں کہنے لگے کہ ''کم سے کم'' آپ جیسے صاحب علم حضرات کو ایسی غیر دانش مندانہ بات زبان پر نہیں لانا چاہیے، جس کتاب کی تالیف تنہا ایک شخص کر سکتا ہے اس کا مطالعہ کرنے کے لیے کسی کو عمر خضر کی ضرورت کیوں ہوگی، جب کہ لکھنے کا کام پڑھنے سے زیادہ دقت طلب ہے''۔(۴۰)

محترم کاکا محمد اسماعیل کے چھوٹے بھائی جناب کاکا محمد ابراہیم جو اپنے بھائی کے دست و بازو تھے اور جنھوں نے عمر لائبریری کی بنیاد رکھی اور اسے بام عروج تک پہنچایا تھا، اچانک ۲۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو رحلت کر گئے، جس کا صدمہ ظاہر ہے بڑے بھائی کو بے حد ہوا ہے، علامہ سید سلیمان ندوی کو اس کا شدید احساس تھا، انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار کاکا اسماعیل صاحب کے نام تحریر کردہ تعزیتی خط میں کیا ہے۔ خط کا متن اس طرح ہے:

''مرحوم کے انتقال کی اطلاع پا کر بڑا رنج ہوا، نہ صرف اس لیے کہ وہ آپ کے عزیز بھائی اور قوت بازو تھے بلکہ اس لیے بھی کہ اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمتیں انجام دیتے تھے، پچھلی ملاقات میں مرحوم سے مل کر اور ان کے اخلاق اور ہمت کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا تھا، یہ خیال بھی نہ تھا کہ تصویر بہت جلد آنکھوں سے دور ہونے والی ہے، آپ کو جتنا صدمہ ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے، مدرسہ کے کاموں کو بھی سخت نقصان پہنچا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، آپ لوگوں کو صبر اور سکون عطا فرمائے، ایسے جوانِ صالح اور خادم دین بہت کم دیکھنے میں آئے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور قوت بخشے اور جامعہ پر رحم فرمائے''۔(۴۱)

علامہ سید سلیمان ندوی عمر آباد کے جلسہ دستار بندی کے بعد مدراس پہنچے تو ان کو ہندوستان کی قدیم جامعہ "مدراس یونیورسٹی" کے شعبہ تحقیقات علمیہ کا معائنہ کرایا گیا جہاں انہوں نے اردو، فارسی اور عربی شعبوں کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا اور اس کی تفصیل معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء کے شمارے میں رقم کی، یہاں صرف اردو سے متعلق جائزے کا حصہ پیش کیا جارہا ہے۔ رقم طراز ہیں:

"اسلامی شعبہ میں جو کچھ کام ہورہا ہے وہ مجھے دکھایا گیا، مولانا محوی (محمد حسین محوی صدیقی) عربی و فارسی کے خوش مذاق عالم اور اردو کے اچھے شاعر ہیں، انہوں نے چھ سات برس کے اندر کئی کتابوں کا ترجمہ اور تصحیح کی ہے اور مقدمے اور تبصرے لکھے ہیں، اخیر زمانے میں اظفری تخلص کا ایک تیموری شہزادہ (محمد ظہیر الدین مرزا علی بخت گورگانی، متوفی ۱۲۳۴ھ) تھا، جو دلی کے لال قلعہ سے بھاگ کر لکھنؤ، پٹنہ، بنگال، اڑیسہ ہوکر مدراس چلا گیا تھا اور وہیں رہ گیا تھا، اس نے اپنے سفر کے حالات ایک کتاب میں لکھے تھے، جس کا نام "واقعات اظفری" ہے، محوی صاحب نے اس کا ملخص ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ چھپ چکا ہے، اس کے علاوہ دلی کے ایک شاعر میر محمدی بیدار کا دیوان مقدمہ اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، بیدار کا یہ دیوان ۱۹۳۵ء میں چھپ کر شائع ہو چکا تھا، اب کیا عجیب بات ہے کہ اس کے دو برس بعد ۱۹۳۷ء میں "ہندوستانی ایکاڈمی" الہ آباد نے اسی دیوان کے کسی دوسرے قلمی نسخے کو غیر مطبوعہ سمجھ کر جناب جلیل احمد صاحب قدوائی کے مقدمے اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، اگر ہمارے علمی اداروں میں آپس میں علمی روابط ہوں تو اس قسم کی محنت اور سرمایہ کی بربادی سے ہم محفوظ رہیں"۔ (۴۲)

قدیم ریاست میسور کے ایک چھوٹے سے شہر چامراج نگر میں جو میسور کے مہاراجہ چامراج وڈیر (ولادت ۱۸۶۳ء، وفات ۱۸۹۴ء) کی جائے پیدائش ہے، (۴۳) اور آج وہ صوبہ کرناٹک کا ضلعی صدر مقام کہلاتا ہے، حکما اور اہل علم کا ایک قدیم خانوادہ رہتا تھا، جس کے سرپرست مولانا حکیم محمد عمر صاحب تھے، جناب حکیم عمر صاحب کے لخت جگر و نور نظر حکیم نور الحق جاوید (ولادت ۱۹۱۴ء، وفات ۱۹۷۳ء) عالم و فاضل ہونے کے علاوہ مخلص قومی خدمت گزار بھی تھے، وہ ملکی اور ملی مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ متفکر و مستعد رہا کرتے تھے، اسی نسبت سے ان کے روابط نہ صرف صوبہ کرناٹک کے اکابر سے تھے بلکہ ملک بھر کے مشاہیر علم و ادب سے بھی تھے، حکیم جاوید صاحب ملک و ملت کے

مختلف مسائل پر اہل علم احباب اور اصحاب دانش افراد سے صلاح ومشورہ کرتے اور انہیں صوبے کے حالات سے باخبر رکھتے تھے، خصوصاً علامہ سید سلیمان ندوی صاحب سے ان کی خط وکتابت رہتی تھی، حکیم صاحب کی ملی خدمات اور قوم کی زبوں حالی پر ان کے دردمندانہ شدید احساسات کی بنا پر علامہ بھی قدر افزائی فرماتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ شہر میسور کے ایک مسلم مینجمنٹ والے تعلیمی ادارے میں کمیٹی نے یہ طے کیا کہ مسلم لڑکیوں کو فن موسیقی کی تعلیم دی جائے، اس پر عوام کی اکثریت اس فیصلہ کی مخالفت میں اتر آئی، افراتفری کا عالم تھا، یہ دیکھ کر اس اسکول کے ذمہ داروں نے علامہ اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) کا یہ شعر" آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے ☆ شمشیر وسناں اول، طاؤس ورباب آخر" اپنی تائید میں پیش کیا اور کہا کہ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں آلات موسیقی "طاؤس اور رباب" کا ذکر کرکے فن موسیقی سیکھنے کے طرف اشارہ کیا ہے، حکیم جاوید نے ان کے استدلال کو غلط ثابت کرتے ہوئے علما و اکابر ملت کے مراسلات پیش کیے اور انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پر آمادہ کیا، جس سے ایک بڑا فتنہ ٹل گیا۔ اس ضمن میں حکیم صاحب نے علامہ موصوف کو مراسلہ روانہ کیا تھا جس کا جواب علامہ نے ۱۲ر جون ۱۹۴۴ء کو اعظم گڑھ سے دیا۔ خط یہ ہے:

"دارالمصنّفین، اعظم گڑھ،

مورخہ ۱۲ر جون ۱۹۴۴ء

محترم ومکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ، "مسلم ایجوکیشن ایڈوائزری کمیٹی" نے اگر مسلمان لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کی تجویز ازخود پیش کی ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے، موسیقی مع آلات اسلام میں سراسر ناجائز ہے، بے شبہ فطری گانا تقریبات میں چھوٹی لڑکیوں اور غیر متمتع عمر والی عورتوں کا مباح ہے مگر یہ فن موسیقی نہیں ہے، اس کو سلیقہ شعرخوانی کہیے، جس کے مضامین بھی فتنہ زا نہ ہوں، موسیقی کے ذریعہ جو جذبات میں ہیجان اور اخلاق میں ابتری پیدا ہوتی ہے اس کا مشاہدہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ہوا ہے، اس لیے بڑے بزرگوں کا قول ہے "الغناء رقیة الزنا" یعنی گانا بدکاری کا منتر ہے، اور تجربہ اس کی صحت پر شاہد ہے، شاہدانِ بازار اور فلم اسٹار کا آئینہ اخلاق وعصمت کس سے پردہ میں ہے اور اس کی کدورت اور پرعیاری کا کس کو علم نہیں، گو وہ دوسری قوموں

کے نزدیک آرٹ اور ہنر ہوں، احکام شریعت سے غیر متعلقہ اشخاص خواہ وہ کیسے بھی لائق ہوں فتویٰ کی مسند پر بیٹھ نہیں سکتے ،افسوس ہے کہ مسلمان غیر قوموں کی نقالی میں اپنے دین وایمان اور اب اپنے ناموس کو اپنے ہاتھوں برباد کررہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مسلمانان میسور کی ہدایت واعانت فرمائے، ان کو چاہیے کہ اس تجویز کی مخالفت میں ہر ممکن کوشش سنجیدگی کے ساتھ کریں۔

اقبالؔ کے شعر کا مطلب بھی غلط سمجھا گیا ہے، شمشیر وسناں عہد کشور کشائی اور فتح و اقتدار کا عہد ہے اور چنگ ورُباب سے لطف انگیزی قوم کے ادبار کا زمانہ، جیسا کہ محمد شاہ رنگیلے دہلی اور واجد علی شاہ اودھ کے مرقع بتاتے نظر آتے ہیں، اس سے یہ مقصود نہیں کہ شاعر کی یہ تعلیم ہے کہ پہلے شمشیر وسناں ہاتھ میں لو، پھر چنگ ورباب میں مصروف ہوجاؤ بلکہ وہ قوم کی ترقی وزوال کے آثار وسامان کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ والسلام"۔(۴۴)

بیسویں صدی کے باکمال اصحاب میں حضرت علامہ سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری وفاؔ (ولادت ۱۹۱۰ء، وفات ۱۹۹۳ء) ابن مولانا سید شاہ ندیم اللہ بختیاری نظامی (متوفی ۱۹۱۴ء) ممتاز عالم، برگزیدہ صوفی، مایہ ناز معلم ومدرس اور مستند شاعر وصحافی کی حیثیت سے معروف ومقبول رہے ہیں، قطب عالم حضرت سید شاہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۱۲۳۵ھ) کے خانوادے کے چشم وچراغ تھے، ان کا تعلیمی وتدریسی سلسلہ جنوب وشمال کے مختلف جامعات سے ہوتا ہوا وطن عزیز رائچور (ضلع کڈپہ، آندھرا پردیش) پہنچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے، جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے فاضل اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ تھے، انہوں نے تفسیر کی خصوصی تعلیم شیخ المفسرین مولانا احمد علی لاہوری (المتوفی ۱۹۶۲ء) سے حاصل کی اور حدیث میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (متوفی ۱۹۵۷ء) کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور انہیں سے بیعت وسلوک کا تعلق قائم کرلیا، ان کی تدریسی خدمات جامعہ دارالسلام عمرآباد میں بارہ سال اور جامعہ باقیات صالحات ویلور میں بیس سال جاری رہیں، خوش ذوق شاعر اور ماہنامہ "مصنف" عمرآباد کے نائب مدیر تھے، انہوں نے جماعت اسلامی کی تشکیل کے موقع پر اپنے والد مولانا سید ندیم اللہ بختیاری کے شاگرد رشید مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۱۹۷۹ء) کا بھرپور ساتھ دیا اور مولانا مودودی کے نائب ونمائندہ بن کر تحریک اسلامی کی دعوت کے ساتھ نامور علما اور مشاہیر ملت کی خدمات میں

حاضری دی اور انہیں اس تحریک سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی، اس سلسلہ میں حضرت بختیاری نے علامہ سید سلیمان ندوی سے بھی رابطہ قائم کیا اور شرف ملاقات حاصل کرتے ہوئے اپنی بات علامہ کے گوش گزار کی۔ راقم نے ایک جگہ تفصیل بیان کی ہے:

> ''آپ جماعت اسلامی کا پیغام لے کر مولانا سید سلیمان ندوی کی قیام گاہ پہنچے تو سید صاحب مولانا بختیاری سے ملنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، خادم نے کہا کہ فی الوقت مولانا (سید سلیمان ندوی) سے ملاقات ممکن نہیں ہے، صبح تشریف لائیں تو دیکھا جائے گا، حضرت بختیاری نے خادم سے فرمایا، آپ مولانا سے کہہ دیں کہ احقر رات بھر دہلیز کے پاس ہی ملاقات کی تمنا لیے بیٹھا رہے گا، خادم نے یہ پیغام مولانا کو سنایا تو مولانا بے چین ہو گئے اور ملاقات کی اجازت دے دی، پھر گفتگو شروع ہوئی تو بختیاری صاحب نے اپنے مقصد کی بات مدلل و مرتب پیش کی، آپ کی تقریر سن کر مولانا سید سلیمان ندوی حیران رہ گئے، پھر کچھ کہنا چاہا، مولانا بختیاری نے انہیں ٹوکتے ہوئے عرض کیا ''میری باتیں فکر کے لیے ہیں ذکر کے لیے نہیں'' یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے''۔(۴۵)

حضرت بختیاری نے اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اپنے شیخ و مرشد حضرت مدنی کے حکم پر مذکورہ تحریک سے مکمل علاحدگی اختیار کر لی اور پھر تا حیات تصوف و سلوک کے فروغ میں جس کو وہ ''تحریک احسانی'' کہتے تھے، دلجمعی کے ساتھ لگے رہے۔(۴۶)

حاصل کلام یہ کہ علامہ سید سلیمان ندوی قطعۂ جنوب کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انہوں نے وہاں تقریر و تحریر کے ذریعہ مفید ترین یادیں چھوڑیں اور خود بھی اس سرزمین کی لطافت و نظافت سے متاثر رہے، یہاں کے اہل علم و اصحاب ثروت دونوں طبقوں نے بصمیم قلب ان کی عزت افزائی و پذیرائی کی اور اپنے اخلاق و کردار اور اپنی سادگی و شائستگی سے علامہ کا دل جیت لیا اور انہیں اپنا گرویدہ بنالیا، ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ۔

مآخذ و حواشی

(۱) سلیمان ندوی سید مولانا، ماہنامہ معارف ماہ ذوقعدہ ۱۳۵۶ھ، جنوری ۱۹۳۸ء نمبر ا، جلد ۴۱، مطبوعہ دار المصنّفین اعظم گڑھ (یوپی)، ص ۵-۶۔ (۲) حبیب الرحمٰن اعظمی عمری، ''چمن جامعہ کے باغبان'' ادارہ تحقیقات اسلامی،

جامعہ دارالسلام عمرآباد (ٹمل ناڈو) مطبوعہ ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۔ (۳) ماہنامہ معارف، ماہ جمادی الاول ۱۳۴۶ھ مطابق نومبر ۱۹۲۷ء، مجلد چہارم، عدد پنجم ص ۳۲۵۔ (۴) سلیمان ندوی سید مولانا، ''شذرات'' معارف اعظم گڑھ، جمادی الاول ۱۳۴۶ھ مطابق نومبر ۱۹۲۷، نمبر ۵، جلد ۲، ص ۳۲۴۔ (۵) شذرات معارف، نومبر ۱۹۲۷، ص ۳۲۵۔ (۶) مکتوب بنام سید عبدالحکیم دسنوی، مطبوعہ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۵ء، جلد ۷۶، عدد ۴، ص ۳۰۴۔ (۷) معارف فروری ۱۹۱۸ء، نمبر ۹، جلد ۲، ص ۹۔ (۸) محمد خورشید عالم ندوی فخر کرناٹک شخصیات، ناشر کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، مقالہ ''قائد الملک نواب غلام احمد کلامی'' مطبوعہ ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۶۔ (۹) ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳۔ (۱۰) راہی فدائی ڈاکٹر، سرسید کے افکار اور جنوبی ہند، ماہنامہ معارف، ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق جنوری ۲۰۱۸ء، جلد ۲۰۱، عدد ۱، ص ۲۲۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۴۔ (۱۲) مکتوب بنام سید عبدالحکیم دسنوی، ص ۳۰۳ تا ۳۱۰۔ (۱۳) راہی فدائی ڈاکٹر ''استشہاد'' ناشر: کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، مطبوعہ ۲۰۱۲ء، ص ۴۵۱۔ (۱۴) قیسی قمر نگری ڈاکٹر، کرنول میں اردو شعر و ادب، آزادی سے پہلے، مطبوعہ دبستان فونڈیشن، کڈپہ ۲۰۱۷ء، ص ۲۳۳۔ (۱۵) اقبال احمد ڈاکٹر، ''افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق کی تعلیمی اور اردو خدمات''، ناشر: ڈاکٹر ایم۔ عبدالحق ایجوکیشنل اکاڈمی، کرنول، مطبوعہ جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۶، بحوالہ صدق جدید لکھنؤ، ۲۹ جنوری ۱۹۶۵ء۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۷۶۔ (۱۷) جلال عبدالکریم صاحب (متوفی ۱۹۳۹ء) مشہور زمانہ روشن کمپنی آمبور کے مالک تھے، ام المدارس باقیات صالحات کے رکن اعظم ہونے کے علاوہ بہت سارے رفاہی، علمی اور دینی انجمنوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، بہت بڑے مالدار ہونے کے باوجود انتہائی متواضع تھے، خود دیندار تھے اور دینی رہبروں کے بہت قدرداں بھی تھے، نواب سی۔ عبدالحکیم صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے تاجر اور ملک التجار ہونے کے ساتھ ہی جود و سخا میں اپنی مثال آپ تھے، بقول مصنف ''مخیرّ اعظم'' مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے دارالاقامہ کی نئی عمارت کے لیے بیک مشت پچاس ہزار روپئے عطا کیے، علاوہ ازیں مدرسہ باقیات میں شعبۂ طب قائم کرنے کے لیے پچاس ہزار روپئے دیے، نواب صاحب کے عطایا سے فیض یاب ہونے والے ادارے جنوب ہی میں نہیں بلکہ شمالی ہند میں بھی رہے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلما، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند وغیرہ مدارس و جامعات ان کے جود و نوال اور آپ کی دریادلی و قدرافزائی سے مستفیض ہوچکے ہیں تفصیل کے لیے دیکھیں ''مخیرّ اعظم'' از مولانا حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی، مطبوعہ سی۔ عبدالحکیم کالج کمیٹی، میل وشارم (ٹمل ناڈو) ۱۹۷۵ء۔ (۱۸) معارف ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ/نومبر ۱۹۲۵ء، نمبر ۵، جلد ۱۶، ص ۳۲۲-۳۲۴۔ (۱۹) محمد اسحاق جلیس ندوی مولوی، تاریخ ندوۃ العلما حصہ اول ''دفتر نظامت ندوۃ العلما لکھنؤ، مطبوعہ ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۳۔ (۲۰) معارف ماہ ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۷ء، جلد ۵۹،

عدد۳، ص۲۳۱-۲۳۲-(۲۱) قمر قادر حسین فہرست کتب مسلم لائبریری بنگلور، مطبوعہ مسلم لائبریری کمیٹی ۲۰۱۴ء، ص۵۰-(۲۲) محمد خورشید عالم ندوی ''فخر کرناٹک شخصیات''، ص۱۵۲-(۲۳) معارف، مطبوعات جدیدہ، شمارہ اگست ۱۹۳۴ء مطابق ۱۳۵۳ھ، نمبر۲، جلد ۳۴، ص۲۳۲-(۲۴) سلیم تمنائی، قومی یکجہتی اور دکنی پریس، انجمن اشاعت اردو، دودھ پیر مکان، عیدگاہ میسور، مطبوعہ ۱۹۸۴ء، ص۱۷۱-(۲۵) معارف نومبر ۱۹۲۵ء، ص۳۲۴-(۲۶) ''مخبر اعظم''، ص۴۶-۴۷-(۲۷) معارف، مطبوعات جدیدہ، ماہ جمادی الاول ۱۳۴۶ھ مطابق نومبر ۱۹۲۷ء، نمبر۵، جلد۲۰، ص۴۰۰-(۲۸) محمد اسمٰعیل سیٹھ مغمومؔ مدراسی، کلیات مغموم، مطبوعہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء، ص۳۲۹-۳۳۰-(۲۹) معارف جمادی الاول ۱۳۴۶ھ مطابق نومبر ۱۹۲۷ء، نمبر۵، جلد۲۰، ص۳۲۲-۳۲۳، شذرات۔ (۳۰) ایضاً، ص۳۲۸-(۳۱) ''مخبر اعظم''، ص۱۷-(۳۲) معارف ماہ نومبر ۱۹۲۷ء مطابق ماہ جمادی الاول ۱۳۴۶ھ، مجلد۲۰، عدد۵، ص۳۲۷-(۳۳) شمس العلما شیخ عبدالجبار صاحب کی تاریخ ولادت اور سفر مصر کا سال اور ان کے والد محترم کا اسم گرامی آپ کے پاسپورٹ سے ماخوذ ہیں، شمس العلما کے پاسپورٹ کا عکس راقم الحروف کو ان کے خانوادے کے ایک نوجوان عالم مولانا محمد الیاس تلّوری نے مہیا کیا تھا، راقم موصوف کا شکر گزار ہے، جزاھم اللہ خیراً۔(۳۴) راہی فدائی ڈاکٹر، مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے علمی وادبی کارنامے، ٹامل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس مطبوعہ ۱۹۹۶ء، ص۶۹-۷۰-(۳۵) شرف الدین خاں مولانا باقوی ''الباقیات'' صدسالہ خصوصی شمارہ مضمون ''میری مادر علمی'' مطبوعہ ۱۹۷۴ء، ص۲۵-(۳۶) ''روداد سالانہ'' بابت ۱۹۳۵ء، مدرسہ باقیات صالحات ویلور، مطبوعہ الکلام الیکٹرک پریس بنگلور، ۱۹۳۵ء، ص۵-(۳۷) معارف، ذوقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق جنوری ۱۹۳۸ء، نمبرا، جلد۴۱، مقالات ''جامعہ دارالسلام عمرآباد کا خطبہ اسناد''، ص۱۳-۱۴-(۳۸) حبیب الرحمٰن اعظمی عمری، ''چمن جامعہ کے باغبان'' ادارہ تحقیقات اسلامی، دارالسلام عمرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۵ء، ص۴۸-(۳۹) محمد اسلم شاد عمری ڈاکٹر ''نقوش جامعہ'' ادارہ تحقیقات اسلامی، دارالسلام عمرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۷ء، ص۲۱۸-(۴۰) ایضاً، ص۲۲۰-(۴۱) چمن جامعہ کے باغبان، ص۳۵-۳۶-(۴۲) ایضاً، ص۴۹-۵۰-(۴۳) معارف ماہنامہ، ماہ شوال المکرم ۱۳۵۶ھ، مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء، جلد۴، عدد۶، شذرات، ص۴۰۲-۴۰۳-(۴۴) معین الدین پاشا، یس الحاج، معمارانِ میسور، انجمن حدیقۃ الادب میسور، مطبوعہ ۲۰۱۶ء، ص۹۷-(۴۵) راہی فدائی-محمد نظام الحق جاوید، ابوالحسان، اکاڈمی کڈپہ ''اوراقِ جاوداں''، مطبوعہ ۱۹۹۴ء، ص۳۸، ۳۹، ۴۰-(۴۶) راقم الحروف (راہی فدائی) حضرت قبلہؒ کا ادنیٰ تلمیذ ہے، ۱۹۷۴ء میں حضرت سے مؤطا امام مالک پڑھ چکا ہے، مذکورہ تمام تفصیلات کا علم راقم کو حضرت والا ہی سے حاصل ہوئی ہیں۔

تحقیق کے بنیادی اصول اور تاریخ طب

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی

اس حقیقت کا کون منکر ہوسکتا ہے کہ طب یونانی ایک طویل اور تابناک ماضی رکھنے کے باوجود آج روزافزوں انحطاط پذیر ہے، اس میں تحقیق واجتہاد کی راہ اس حد تک مسدود ہوچکی ہے کہ اس کے دوبارہ کھلنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال کی واحد وجہ سخت کوشی سے اجتناب اور آبا پرستی کی بیماری ہے جس میں اس وقت طبی دنیا مبتلا ہے، عہد حاضر کے اطبا کا اب ایک ہی مشغلہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف بالخصوص زکریا رازی، ابن سینا اور ابوالقاسم زہراوی جیسے نابغۂ روزگار اطبا کی تحسین وتوصیف میں ایک دوسرے سے مسابقت کریں اور اس میں ہر ممکن مبالغہ سے کام لیں، ان کی آبا پرستی کا حال یہ ہے کہ انہوں نے تسلیم کرلیا ہے کہ اطباءِ سلف کا علم کامل تھا، ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، ان کے بہم کردہ علم میں اب کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے، دور حاضر کے اطبا کا کام محض ان کی اتباع وتقلید ہے، ہمارے لیے اس قدر علم کافی ہے کہ ہم رازی اور ابن سینا کی کتابوں کی سرسری طور پر ورق گردانی کرلیں، ان کے علمی کاموں پر تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ لوگ کامل الفن اور اصحاب بصیرت تھے، اگر کسی صاحب علم طبیب نے کبھی جرأت رندانہ دکھائی اور اعتراض کردیا کہ ابن سینا کی کتاب ''القانون فی الطب'' میں تشریح (اناٹومی)، منافع الاعضا (فزیالوجی) اور امور طبیعیہ سے متعلق یہ اور یہ غلطیاں موجود ہیں تو فوراً ہی ہر طرف سے آواز اٹھنے لگتی ہے کہ یہ اعتراض لایعنی ہے، قصور فہم ہے، ناقد کی نارسائی عقل ہے نہ کہ ابن سینا کی خطا۔

اس کورانہ تقلید اور شخصیت پرستی کی وجہ سے طب یونانی سے متعلق اب تک جو کام ہوا ہے وہ علمی وتحقیقی اعتبار سے چنداں اہمیت نہیں رکھتا، تاریخ طب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، ہم نے اس

آر، زیڈ-901,B، فلیٹ نمبر ۴۰۲، لین نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹۔

مضمون میں تاریخ طب کے حوالے سے تحقیق کے چند بنیادی اصولوں کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں پائی جانے والی بعض کوتاہیوں کو بھی بیان کیا ہے تاکہ آئندہ اس نوع کی غلطیوں کا ارتکاب نہ ہو۔

تحقیق کے بعض اصول وہ ہیں جو ہر شعبۂ علم وفن کے تحقیقی کاموں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے بے اعتنائی کے معنی دراصل تحقیق کی بے اعتباری کے ہیں اور بعض اصول تحقیق وہ ہیں جن کو ریسرچ میں اساسی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن ان کا لحاظ تحقیق میں وزن پیدا کرتا ہے، تحقیق کے ان دونوں اصولوں کی تفصیل اگلی سطروں میں پیش کی گئی ہیں۔

طبی لٹریچر کا مطالعہ (Study of Source Material): تحقیق کا یہ اولین اصول ہے کہ جس موضوع پر تحقیق مدنظر ہے اس سے متعلق جملہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لٹریچر کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، اس مطالعہ سے صرف تاریخ طب پر مشتمل لٹریچر کا مطالعہ مراد نہیں بلکہ وہ تمام لٹریچر مراد ہے جو اطباء سلف وخلف نے طب کے موضوعات پر تیار کیا ہے، اس سلسلے میں غیر مطبوعہ طبی لٹریچر (ذخیرۂ مخطوطات) زیادہ اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ ان میں ایسی معلومات مل سکتی ہیں جو تاریخ نگاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئی ہوں، کسی طبیب کی علمی حیثیت کا صحیح تعین اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں کاموں کو غور سے پڑھ لیا جائے۔

اس وقت طب یونانی کی تاریخ پر جو کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں ان میں اطبا کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا بڑی حد تک احاطہ کرلیا گیا ہے، لیکن ان کے علمی کاموں کا معروضی جائزہ نہیں لیا گیا ہے، اکثر مورخین طب نے ان کی تالیفات بالخصوص ان کے غیر مطبوعہ کاموں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا اور اس سلسلے میں سرسری معلومات پر اکتفا کرلیا، اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ عہد حاضر میں طب یونانی کی تاریخ پر جو کتاب بھی لکھی جائے اس میں اصول تحقیق کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

مزید برآں تاریخ طب کے اولین ماخذ کی مراجعت بھی ضروری ہے، تاریخ طب کے موضوع پر عربی زبان میں لکھی گئی کتابوں کو اولین اور بڑی حد تک معتبر حوالوں کی حیثیت حاصل ہے، ان کتابوں میں جمال الدین قفطی کی ''تاریخ الحکما''، ابن ندیم کی ''الفہرست''، ابن ابی اصیبعہ کی ''عیون الانباء فی طبقات الاطباء'' داؤد انطاکی کی ''طبقات الاطباء'' اور ابن جلجل کی ''طبقات الاطباء والحکماء'' قابل ذکر ہیں، اس موضوع پر بعض اطباء سلف کی کتابیں حوادث زمانہ کی نذر ہوگئیں اور اب ان کا کہیں کوئی

سراغ نہیں ملتا، مثلاً اسحاق ابن حنین کی ''تاریخ الاطبا''، یحییٰ نحوی کی ''تاریخ الاطبا'' اور زکریا رازی کی ''سیرۃ الحکما'' وغیرہ۔

تاریخ طب سے متعلق مذکورہ کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ سے زیادہ تذکرے ہیں جن میں اطبا کے حالات زندگی اور ان کی تالیفات کی تفصیل مل جاتی ہے لیکن ان میں کہیں تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ کی جھلک نہیں ملتی، اکثر مقامات پر حوالے بھی نہیں ملتے کہ ماضی میں اس کا زیادہ رواج نہ تھا، ان کمیوں کے باوجود چونکہ ان کی حیثیت اولین تاریخی حوالوں کی ہے اور اطباء قدیم کے حالات زندگی اور ان کے علمی کاموں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ماخذ یہی کتابیں ہیں، اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن انہی کتابوں پر کلی انحصار مناسب نہیں ہے، ان کتابوں کے ساتھ ہر طبی عہد سے متعلق عام تاریخی کتابوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، بالخصوص وہ کتابیں جو کسی خاص علم وفن سے متعلق ہیں یا کسی خاص ملک کے علما وفضلا کے حالات اور علمی کاموں پر روشنی ڈالتی ہیں، ان غیر طبی مصادر کے مطالعہ سے ہر عہد میں طب کی ترقی کی سمت و رفتار کا تعین آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور طبی واقعات کی صحت کی جانچ بھی آسان ہو جائے گی۔

غیر طبی مصادر میں سفرناموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ سفرنامے عربی، فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں موجود ہیں، ابن بطوطہ، منوسی، برنیر اور بعض چینی سیاحوں کے سفرنامے ہندوستان میں طب یونانی کی تاریخ کو سمجھنے میں بے حد مددگار ہیں۔

غیر جانبداری (معروضیت Objectivity): کسی بھی علمی کام میں تلاش و تحقیق کا عمل بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعہ میں حتی الامکان غیر جانب دار ہو، ہر دور کے اہل علم و تحقیق کی ایک بڑی خامی یہ رہی ہے کہ وہ جس ملک وقوم سے تعلق رکھتے ہیں اور جس علم وفن اور نقطہ نظر کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں ان کے مطالعہ و تجزیہ میں وہ بالعموم غیر جانبدار نہیں رہتے، خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور معائب سے چشم پوشی کرتے ہیں یا ان کا ذکر بالکل سرسری انداز میں کرتے ہیں، اس غیر علمی روش سے عہد حاضر کے بہت سے اصحاب علم بھی محفوظ نہیں ہیں۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کوئی محقق سو فیصد غیر جانبدار ہو سکتا ہے لیکن ایک سچے محقق سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ حتی الوسع اپنی تحقیق کو معروضی رخ دے گا اور شخصی و مسلکی وابستگی اور ہر طرح کے

تعصب سے بلند ہوکر حقائق کو معلوم کرے گا، کسی بڑی سے بڑی علمی شخصیت کی عقیدت اظہار حق میں مانع نہیں ہوگی اور کسی معروف دانشور کے نقطہ نظر سے اختلاف کی صورت میں وہ کتمانِ حق کا مجرم نہ بنے گا، یہاں میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

حکیم ابوالفتح گیلانی (وفات ۱۵۸۹ء) عہد اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۶ء) کا ایک نامور طبیب، شاعر و ادیب اور نوبل گزرا ہے، اس عہد کے مشہور عالم اور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ بے دینی اور جملہ اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل تھا، (۱) لیکن اسی عہد کے ایک دوسرے مورخ شاہ نواز خاں نے لکھا ہے کہ ''وہ مخلوق خدا کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی رکھتا تھا، وہ کریم الصفات، محسن زماں اور کمالات میں یگانۂ روزگار تھا''، (۲) صاحب مآثر رحیمی نے بھی حکیم کی تحسین کی ہے اور لکھا ہے کہ ''بادشاہ کی ملازمت میں اسے جو مرتبہ واستحقاق حاصل تھا، اس کی بنیاد پر وہ خلق خدا کے مقاصد ومطالب کی تکمیل میں خود کو اس درجہ مصروف رکھتا تھا کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جاسکتا ہے''۔ (۳)

ان معاصر مورخین کے بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کا مذکورہ بیان صحیح نہیں ہے اور انہوں نے محض تشیع سے بیزاری اور معاصرانہ حسد کی وجہ سے حکیم ابوالفتح کو متہم کیا ہے اور اس کی تنقیص کی ہے، حکیم ابوالفتح نے مختلف اوقات میں اپنے معاصرین اور احباب واقربا کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے بھی ملا عبدالقادر بدایونی کے الزامات کی تردید ہوتی ہے، حکیم اپنے بھائی ہمام کو لکھتا ہے:

> ''دل بخدائے خود پیوستہ دار واز یار واز بر بردار خود گسستہ باش، برخواہش خود خواہش اورا مقدم دار، ودل تنگ مباش، بہ جملگی باطن وظاہر خود اورا باش و بہ تربیت نفس ناطقہ مشغولی ورزد، بمعائب نفس بیناشو، من بعد خودرا ایلچی مداں وبر مخالف نفس صبور باش، ومطالعہ احیاء وکیمیا را از دست منہ وبجز سخن خدا پرستاں مشنو ومگو وبغیر ازیں مطالعہ جلسہ وغلبہ باکسی آمیزش مکن، ومرا دررنگ آنکہ گزاشتہ رفتہ بودی کشتہ ومردۂ دنیا می دان، ودرغم من مباش وفرزندان خودرا درارض خدا مہمان وپی نعمت حقیقی دان واز ہیچ کس دربیم وامید مرو''۔ (۴)

کون کہہ سکتا ہے کہ اس عبارت کا لکھنے والا بے دین ہوسکتا ہے، کیا کوئی بے دین شخص تربیت نفس کے لیے اپنے بھائی کو امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' کے مطالعہ کے

ساتھ خدا پرستوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے کی ہدایت کرے گا؟

خواجہ حسین ثنائی نے بستر مرگ سے حکیم ابوالفتح کو ایک خط لکھا جس میں بیوی بچوں کے بارے میں فکر و اندیشہ کا اظہار تھا، جواب میں حکیم نے اسے تسلی دی کہ خدا کے نزدیک جو چیز مطلوب ہے وہ عجز و نیازمندی ہے اور اس دولت سے تمہارا دامن خالی نہیں ہے، اس لیے خدا کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اس پر راضی و شاکر رہو اور دوستوں اور بچوں کے غم سے بے نیاز کہ خدا تمہارے ساتھ ان سب کا محافظ ہے۔ (غم فرزنداں و یاراں مخور کہ آنہا ہمچو شما در حفظ حمایت الٰہی محفوظ اند) (۵)

اس خط سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بے دینی تو کجا نہایت درجہ مذہبی آدمی تھا، ملا عبدالقادر بدایونی نے محض عقیدے کے اختلاف اور معاصرانہ چشمک کی وجہ سے اس کو بے دین لکھ دیا اور بعد کے اکثر مورخین نے بلاتحقیق اس الزام کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا۔

غلوئے عقیدت کی ایک مثال ابن سینا (وفات ۱۰۳۷ء) کی شخصیت ہے، جس طرح فلسفہ میں ابن سینا کو ابوبکر زکریا رازی (وفات ۹۲۶ء) پر برتری حاصل ہے اسی طرح طب میں رازی ابن سینا پر تفوق رکھتا ہے، یہاں ملحوظ رہے کہ رازی فلسفی اور کیمیا داں بھی تھا، ''الحادی''، ''کتاب المنصوری'' اور ''کتاب الحصبہ والجدری'' حکیم رازی کی وہ تالیفات ہیں جو اس کی معالجانہ بصیرت اور طبی ژرف نگاہی کا ناقابل تردید ثبوت ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود اطباء قدیم و جدید دونوں نے رازی سے کہیں زیادہ ابن سینا کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس کی معروف کتاب ''القانون فی الطب'' کو ''میڈیکل بائبل'' کا درجہ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''القانون'' کوئی تحقیقی کتاب نہیں ہے، اس کا ایک بڑا ثبوت اس کا حصہ تشریح ہے، ابن سینا نے ''تشریح'' اور ''منافع الاعضا'' کے بیان میں جالینوس کی مکمل پیروی کی ہے جس کے نتیجے میں اس سے متعدد غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ایک بڑی تشریحی غلطی اس کا یہ بیان ہے کہ قلب کے دائیں بطن (Right Ventricle) میں جمع شدہ خون غیر مرئی سوراخوں (Invisible Pores) کے ذریعے قلب کے بائیں بطن میں چلا جاتا ہے، منافع الاعضا (فزیالوجی) کے بیان میں بھی ابن سینا نے متعدد غلطیاں کی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، ''القانون'' کا حصہ کلیات بلاشبہ قابل قدر اور لائق استفادہ ہے، صحیح بات یہ ہے کہ ''القانون'' کی حیثیت ایک درسی کتاب (Text Book) کی ہے

اوراس اعتبار سے وہ قابل ترجیح ہے۔

حکیم رازی کی طبی عظمت و برتری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ابن سینا نے ''کتاب الحادی'' سے بکثرت خوشہ چینی کی ہے، لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا ہے، اتنا ہی نہیں اس نے اس کتاب سے متعدد عبارتیں ادنیٰ لفظی تغیر کے بغیر لے لی ہیں لیکن ایک کا بھی حوالہ نہیں دیا ہے، حکیم صیانت اللہ مرحوم نے اس خوشہ چینی کا ذکر تفصیل سے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو ملک کے معروف جریدہ معارف (شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ) میں شائع ہو چکا ہے۔

اطبا نے ابوسہل مسیحی (وفات ۱۰۱۰ء) کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے اوراس کی وجہ ابن سینا اوراس کی کتاب ''القانون فی الطب'' سے ان کی غیر معمولی عقیدت واشتغال ہے، ابوسہل مسیحی کی بہت سی کتابیں ضائع ہوگئیں پھر بھی اس کی دو محفوظ تالیفات ''کتاب المأۃ'' اور الطب الکلی'' اس کی طبی عظمت کی شہادت کے لیے کافی ہیں لیکن آج تک ان دونوں کتابوں کو طبی حلقوں میں وہ جگہ نہیں مل سکی جس کی وہ مستحق ہیں، یہ بات کم اطبا کو معلوم ہوگی کہ ابوسہل مسیحی ایک بڑا منطقی اور فلسفی بھی تھا، افسوس کہ اس فن میں اس کی اکثر کتابیں تلف ہوگئیں، بلاشبہہ وہ ایک بڑا محقق طبیب تھا، اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ابوسہل مسیحی نے اپنی مذکورہ دونوں کتابوں میں طب کے کلیاتی مباحث کو جس تحقیق ووضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اس تحقیق ووضاحت کے ساتھ ''القانون'' میں ان مباحث کو نہیں پیش کیا گیا ہے۔

معروضی مطالعے کے نتیجے میں جو معلومات حاصل ہوں ان کو اسی وقت ضبط تحریر میں لایا جائے جب وہ تنقیدی جائزے میں درست ثابت ہوجائیں، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تحقیق اور تنقید لازم وملزوم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نامکمل ہے، اسی طبیب کو ایک بڑے محقق کا درجہ حاصل ہوگا جس کا تنقیدی شعور خوب پختہ ہو، کیونکہ اس صفت کے بغیر کوئی صحیح اور غلط، ادنیٰ واعلیٰ اور وقتی اور دائمی امور کا ادراک اس کے لیے مشکل ہوگا، دوسرے علوم کے مقابلے میں علم تاریخ میں تنقیدی شعور کی کچھ زیادہ ضرورت ہے، اس لیے کہ اس میں کذب بیانی اور دروغ گوئی کا امکان دوسرے علوم سے کچھ زیادہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ تاریخ جامع ہے یعنی ہر علم وفن کا رشتہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔

تاریخ طب کی اکثر کتابوں میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی بہت کم اور نقل درنقل کا عمل زیادہ ہے، جو علمی وتحقیقی غلطیاں بقراط، جالینوس، ابن سینا اور دوسرے اطباء سلف سے صادر ہوئیں ان کو آج

بھی بے خبری میں نقل کردیا جاتا ہے، اگر ایک کتاب میں کسی طبیب کی تاریخ وفات غلط لکھ دی گئی ہے تو بعد کے تمام طبی تذکروں اور کتابوں میں وہی غلط تاریخ وفات ملے گی، اسی طرح اگر کسی کتاب میں کوئی غلط بات درج ہے تو اس کو بھی بجنسہٖ نقل کردیا جاتا ہے، مثلاً ریوی دورانِ خون کے سلسلے میں جالینوس کا غلط بیان تمام متقدمین اطبا کی تحریروں میں موجود ہے، ابن نفیس (وفات: ۱۲۸۸ء) واحد طبیب ہے جس نے تیرہویں صدی عیسوی میں اس غلطی کی اصلاح کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا تنقیدی شعور پختہ تھا، اس کے بغیر وہ جالینوس کی تشریحی غلطی کی اصلاح نہیں کرسکتا تھا۔

رازی میں بھی تنقیدی شعور بدرجہ اتم موجود تھا، اس نے جالینوس پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اس کی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں، (۶) اس معاملے میں ابن بیطار (وفات ۱۲۴۸ء) بھی بلند حیثیت رکھتا ہے، اس کی معروف تالیف ''الجامع فی الادویۃ المفردۃ'' میں اس کا تحقیقی اور تنقیدی شعور اپنے عروج پر ہے، مقدمہ میں لکھتا ہے:

> ''متقدمین اور متاخرین اطبا نے دواؤں کے باب میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کو میں نے پوری صحت کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن اسی بات کو صحیح تسلیم کیا ہے جو مشاہدہ سے درست ثابت ہوئی یا سچی خبر پر مبنی تھی''۔ (۷)

آگے مزید لکھتا ہے:

> ''اس کتاب کی تالیف کی ایک غرض ہر اس دوا کے بارے میں متنبہ کرنا ہے جس کے بیان میں متقدمین اور متاخرین اطبا کو کسی قسم کا کوئی وہم ہوا یا ان سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے اور اس غلطی کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے کتاب اور نقل پر اعتماد کیا ہے جب کہ میرا اعتماد مشاہدہ اور تجربہ پر ہے''۔ (۸)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تحقیق کے عمل میں تنقیدی شعور بڑی اہمیت رکھتا ہے، تنقید کی غربال میں چھانے بغیر واقعات اور حقائق کی صحیح صورت سے آشنائی مشکل ہے۔

سہل انگاری سے گریز: تحقیق میں سہل انگاری سے اجتناب لازمی ہے، تحقیق نہایت صبر آزما کام ہے، اس میں بڑی جانکاہی اور دیدہ ریزی کی ضرورت ہے، تاریخی کتابوں میں بہت سی غلطیوں کی وجہ ان کے مولفین کی عجلت و بے احتیاطی ہے۔

حکیم محمد کبیر الدین طب یونانی کے ایک بلند پایہ اور کثیر التصانیف طبیب تھے، انہوں نے خاندان شریفی کے معروف طبیب حکیم صادق علی خاں (وفات ۱۸۴۸ء) کی فارسی کتاب ''زادغریب'' کا جو بری اور بحری سفر کے مسائل اور ضروریات پر ہے، اردو میں ترجمہ کیا اور ۱۹۲۷ء میں دفتر المسیح سے ''مخازن التعلیم معروف بہ زادغریب'' کے نام سے شائع کیا، اس نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک کتاب ہے، حالانکہ یہ دو کتابیں ہیں، ''زادغریب'' کے مولف جیسا کہ اوپر بیان ہوا، حکیم صادق علی ہیں اور ''مخازن التعلیم'' کے مولف ان کے صاحبزادے حکیم غلام مرتضیٰ (وفات ۱۸۷۵ء) ہیں، (۹) اس کتاب کا موضوع ''کلیات ومنافع ادویہ مفردہ ومرکبہ'' ہے لیکن حکیم کبیر الدین نے ان دونوں کو ایک کتاب قرار دے کر اس کا اردو ترجمہ شائع کر دیا، کھلی بات ہے کہ اس غلطی کی وجہ حکیم موصوف کی سہل انگاری ہے جو ان کے کثرت کار کا نتیجہ تھی، بعد کے مورخین طب نے اپنی کتابوں میں اس غلطی کی اصلاح نہیں کی، مثلاً حکیم سید ظل الرحمن نے اپنی کتاب ''قانون ابن سینا اور اس کے شارحین'' میں ''مخازن التعلیم'' کو حکیم صادق علی خاں کی تالیف قرار دیا ہے۔(۱۰)

ایک دوسرے تاریخ نگار حکیم کوثر چاند پوری نے بھی اسی سہل انگاری کا ثبوت دیا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ''حکیم فتح اللہ، حکیم ابوالقاسم شیرازی کا بیٹا اور حکیم فتح اللہ گیلانی کا پوتا تھا''، (۱۱) لیکن حکیم فتح اللہ شیرازی حکیم فتح اللہ گیلانی کا پوتا کیونکر ہوسکتا ہے؟ دونوں میں علاقائی اور زمانی فصل حائل ہے، حکیم فتح اللہ گیلانی عہد اکبر کے نامور طبیب اور دانشور حکیم ابوالفتح گیلانی کا لڑکا تھا (توزک جہانگیری، ص ۵۸) عہد جہانگیری میں بھی وہ درباری طبیب کی حیثیت سے موجود تھا، (توزک جہانگیری، ص ۳۴) اگر اس کی کوئی اولاد نرینہ تھی تو وہ ابوالقاسم شیرازی نہیں ہوسکتا کیوں کہ ہندوستان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، حکیم فتح اللہ شیرازی بھی عہد شاہجہاں میں ایران سے ہندوستان آیا اور اس کے دربار سے وابستہ ہوا، (بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۵۰) اس لیے حکیم کوثر چاند پوری کا یہ بیان کہ حکیم فتح اللہ (شیرازی) حکیم فتح اللہ گیلانی کا پوتا تھا، غلط ہوجاتا ہے۔

حکیم سید علی حیدر جعفری نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ طب واطباء قدیم'' میں بے احتیاطی کی ہے، مثلاً علی بن ربن طبری کی معروف کتاب ''فردوس الحکمت'' کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: ''یہ کتاب سات انواع، تیس مقالات، بیس ابواب کا مجموعہ ہے''، (۱۲) لیکن ابواب کی تعداد بیس کے بجائے

۳۶۰ ہے، اس کے علاوہ فاضل مولف نے باعتبار انواع ابواب کی جو تفصیل دی ہے اس میں بھی غفلت دخیل ہے، مثلاً ان کے بیان کے مطابق نوع دوم کے ابواب کی تعداد ۴۲ ہے، جب کہ یہ ۵۲ ہے۔

حکیم ابوالقاسم زہراوی کی شہرہ آفاق کتاب ''التصریف لمن عجز عن التالیف'' کے تعارف میں بھی حکیم جعفری صاحب نے غلطی کی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ''اس کتاب کو باعتبار مضامین وفن تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، حصہ اول ادویہ سے متعلق ہے، حصہ دوم کیمیا ودوا سازی سے اور تیسرا حصہ جراحیات سے متعلق ہے''۔(۱۳) یہ تعارف مطابق اصل نہیں ہے، یہ کتاب تیس مقالات پر مشتمل ہے، ابتدائی دو مقالات میں مختلف مزاجوں، غذاؤں، ترکیب ادویہ، اقسام امراض وعلامات، اصول علاج اور تشریح سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد ۲۷ مقالات کا موضوع بحث ادویہ اور دوا سازی (صیدلہ) ہے، آخری مقالہ جراحیات پر ہے جو زیادہ شہرت رکھتا ہے۔(۱۴)

اس طرح کی غلطیاں دوسرے مورخین طب نے بھی کی ہیں، یہ غلطیاں محض اس وجہ سے ہوئیں کہ انہوں نے تلاش وجستجو سے کام نہیں لیا اور اپنے پیش رو مورخین کے بیانات پر اعتماد کرلیا، ان کی سست روطبیعت اس امر میں مانع ہوئی کہ وہ اصل کتابوں کی مراجعت کرتے۔

ثانوی حوالوں سے حتی الامکان اجتناب: ایک محقق کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ ثانوی حوالوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اصل اور بنیادی حوالوں کی طرف رجوع کرے، ثانوی حوالوں پر انحصار کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ان میں مندرج غلط تاریخی واقعات وبیانات جوں کے توں بعد کی کتابوں میں منتقل ہوجاتے ہیں اور تاریخ نگار کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے کہاں اور کیا خطا کی ہے، تسلسل کے ساتھ نقل ہونے والے غلط تاریخی بیانات آگے چل کر درجہ استناد حاصل کر لیتے ہیں اور سہل کوش مورخین ان بیانات کو اپنی کتابوں میں کسی ادنیٰ تامل کے بغیر نقل کردیتے ہیں، یہاں ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔

حکیم شفائی (وفات ۱۶۲۸ء) عہد مغلیہ میں اکبر بادشاہ کے دربار کا ایک نامور طبیب اور شاعر تھا، وہ صاحب تصانیف بھی تھا، اس کی ایک طبی کتاب کا نام ''شفاء العلیل'' ہے، ''قرابادین شفائی''، ''قرابادین مظفری''، ''طب شفائی''، ''شفاء المریض''، ''خلاصۃ الشفا'' اور ''منتخب الطب'' کے نام سے بھی یہ کتاب ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہے، کئی تذکرہ نگاروں مثلاً اسٹوری (۱۵) حکیم سید ظل الرحمن (۱۶) اور بعض دوسرے اطبا نے ان سب کتابوں کو حکیم شفائی کی جداگانہ تالیفات قرار

دیا ہے جو صحیح نہیں ہے، اس غلطی کی وجہ ثانوی حوالوں پر اعتماد ہے، انہوں نے اصل کتاب ''شفاء العلیل'' سے مذکورہ کتابوں کا موازنہ و مقابلہ نہیں کیا ورنہ اس غلطی کا ارتکاب وہ ہرگز نہ کرتے۔

اسی طرح حکیم شرف خان (وفات ۱۸۰۷ء) کی کتاب ''تحفہ عالم شاہی'' کے بارے میں حکیم سید ظل الرحمن اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ ہندی اغذیہ و فواکہ کے منافع کے بیان میں ہے جو بالکل غلط ہے (۱۷) ہندی بقول و فواکہ و اغذیہ کے بارے میں حکیم شرف الدین خاں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی کتاب ''تالیف شریفی'' کا جز ہے، (۱۸) بعد میں یہ حصہ ''رسالہ در خواص بقول و فواکہ و اغذیہ ہندیہ'' کے نام سے الگ شائع ہوا، رسالہ مذکور یعنی ''تحفہ عالم شاہی'' دراصل حکیم موصوف کی ایک دوسری تالیف ''رسالہ خواص الجواہر'' کی تلخیص ہے، دیباچۂ کتاب میں اس کی تصریح موجود ہے، حکیم شریف خاں لکھتے ہیں:

> ''لہٰذا رسالہ ''خواص الجواہر'' را کہ تالیف ایں حقیر است تلخیص و انتخاب کردہ بمناسبت اسم سامی و نام نامی آنحضرت بہ تحفۂ عالم شاہی موسوم ساخت''۔ (۱۹)

اس غلطی کی وجہ ثانوی حوالوں پر اکتفا کرنے کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

حوالوں کی صحت کا اہتمام: تحقیق کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ تاریخی واقعات و بیانات کے حوالے درست طور پر دیے جائیں کہ اس سے تحقیق کو اعتبار و استناد حاصل ہوتا ہے، تاریخ طب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے زیادہ تر کتابوں میں حوالوں کی غلطیاں کثرت سے موجود ہیں اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا یعنی سہل انگاری اور ثانوی حوالوں پر اعتماد، بعض کتابوں میں سرے سے حوالے ہی نہیں دیے گئے ہیں، مثلاً حکیم سید ظل الرحمن کی کتاب ''ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین'' میں ایک بھی حوالہ نہیں ہے، اس طرح کی کتابوں کے بارے میں قاری کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ اس میں کتنا حصہ صاحب کتاب کا اور کتنا حصہ دوسروں کا ہے۔

اسی طرح بعض کتابوں میں فرضی حوالے دیے گئے ہیں، مثلاً حکیم سید علی کوثر چاند پوری نے اپنی کتاب ''اطبائے عہد مغلیہ'' میں اکبر بادشاہ کی طبی مہارت کے ثبوت میں دو معالجاتی واقعے ''اکبرنامہ'' (ج ۳، ص ۴۸۰) اور ''مآثر الامرا'' (ج ۳، ص ۵۶۶) کے حوالے سے لکھے ہیں (۲۰) لیکن راقم سطور نے ان کتابوں کی مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ یہ فرضی حوالے ہیں، ''اکبرنامہ'' اور ''مآثر الامرا''

دونوں کے محولہ صفحات پر یہ معالجاتی واقعات مندرج نہیں ملے۔

معاصر طبوں سے واقفیت: طب یونانی نے اپنے طویل سفر میں دوسری طبوں سے اخذ واستفادہ کیا ہے، ہندوستان میں استفادہ کا یہ عمل یہاں کی روایتی طب آیوروید سے جڑا ہوا ہے، علی بن ربن طبری (وفات ۸۵۵ء) پہلا طبیب ہے جس نے اپنی کتاب ''فردوس الحکمۃ'' کے اخیر میں ایک پورا باب طب ہندی کے لیے رکھا ہے، ربن طبری کے بعد رازی (وفات ۹۲۶ء) علی ابن عباس مجوسی (وفات ۹۹۶ء) اور ابن سینا (وفات ۱۰۳۷ء) جیسے معروف اطبا کی کتابوں میں طب ہندی کے حوالے موجود ہیں، ہندوستانی اطبا میں حکیم الیاس بن شہاب ملقب بہ ضیاء کی ''راحت الانسان''، ضیا محمد مسعود رشید زنگی معروف بہ مبارکباد (وفات ۱۳۵۱ء) کی ''مجموع ضیائی''، بہوا بن خاص خاں کی ''معدن الشفاء سکندری شاہی''، محمد قاسم فرشتہ کی ''دستور الاطبا'' امان اللہ خاں (وفات ۱۶۳۷ء) کی دستور الہنود'' نورالدین محمد عبداللہ (وفات ۱۶۴۸ء) کی ''طب دارا شکوہی'' اور دور آخر کے جلیل القدر طبیب حکیم شریف خاں کی کتاب ''تالیف شریفی'' میں طب ہندی سے اخذ واستفادہ بالکل واضح ہے، اسی طرح آیوروید نے بھی یونانی طب کے اثرات قبول کیے ہیں۔

اس بنا پر ایک مورخ طب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں طبوں سے کم از کم نظری واقفیت رکھتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ دونوں طبوں نے ایک دوسرے سے کس نوع کے اور کس حد تک اثرات قبول کیے ہیں۔

تعین قدر (Evaluation): جس طرح ایک تاریخ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر عہد کے اطبا کی شخصیت اور ان کے علمی وفنی کاموں کی تفصیل پیش کرے، اسی طرح اس کے لیے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ علمی اور تحقیقی اعتبار سے ان کے کام کا کیا درجہ ہے، انہوں نے کوئی علمی اضافہ کیا ہے یا محض اپنے پیش روؤں کی تقلید کی ہے اور ان کے علمی کاموں کے نقل واعادہ پر اکتفا کیا ہے؟ اکثر مورخین طب نے اپنی کتابوں میں تحقیق کے اس اہم اصول کی پیروی نہیں کی ہے، بلاشبہہ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اس عمل کو انجام دیے بغیر کوئی قابل لحاظ علمی پیش رفت ممکن نہیں ہے۔

آخر میں اس تلخ حقیقت کے اعتراف میں کوئی مضائقہ نہیں کہ طب یعنی یونانی عربی طب (Graeco-Arab Medicine) کی طویل تاریخ پر اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جسے

ہر اعتبار سے محقق اور مستند کہا جا سکے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن اطبا نے تاریخ طب پر چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کئی مولفین عربی اور فارسی سے جس میں طب کا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے، نابلد ہیں، جو اطبا ان مشرقی زبانوں سے واقف ہیں انہوں نے دوں ہمتی کے باعث طب کے اصل مراجع (Primary Sources) بالخصوص مخطوطات کی طرف بہت کم مراجعت کی اور ثانوی حوالوں پر اکتفا کرلیا۔

ماضی کا معاملہ حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اس دور میں تاریخ طب پر جو چند کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی تحقیق اور تلاش و جستجو کم اور تقلید اور سہل پسندی زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابیں قابل استناد نہیں ہیں۔

مستقبل ایک ایسے مورخ طب کا منتظر ہے جو مشرقی زبانوں کے ساتھ انگریزی سے بھی کامل طور پر واقف ہو، سخت کوش ہو اور اجتہادی طبیعت بھی رکھتا ہو، تاریخ طب کی اطمینان بخش تسوید کا سہرا اسی مورخ کے سر بندھے گا۔

حوالے

(۱) منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ ۱۸۶۵ء، ج ۳ص ۱۶۷۔ (۲) مآثر الامرا، شاہ نواز خان، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ ۱۸۹۵ء، ج ا ص ۵۵۷۔ (۲) مآثر رحیمی، عبدالباقی نہاوندی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ج ۳، ص ۸۴۷۔ (۴) رقعات ابوالفتح گیلانی، حکیم ابوالفتح گیلانی، مرتبہ: ڈاکٹر محمد بشیر، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۳۹۔ (۵) ایضاً ص ۱۲۵۔ (۶) دیکھیں ''کتاب الشکوک علی جالینوس'' محمد زکریا رازی۔ (۷) الجامع فی الادویۃ المفردۃ (مخطوطہ) ابن بیطار، مقدمہ، ص ۳۔ (۸) ایضاً۔ (۹) مخازن التعلیم (مخطوطہ) حکیم محمد صادق علی خاں، مقدمہ، ص ۳، ۴۔ (۱۰) قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمٰن، طبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۱۷۸۔ (۱۱) اطبائے عہد مغلیہ، حکیم سید علی کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۱۔ (۱۲) تاریخ طب و اطباء قدیم، حکیم سید علی حیدر جعفری، طابع نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۵ء، ص ۸۴۔ (۱۳) ایضاً ص ۱۱۲۔ (۱۴) تفصیل کے لیے دیکھیں: کلیات طب کے مصادر و مراجع، حکیم محمد رضی الاسلام ندوی، طبع اول ۱۹۹۵ء، ص ۸۳۔ (۱۵) پرشین لٹریچر سی، اے، اسٹوری، لندن ۱۹۷۱ء، ج ۲، ص ۲۴۵۔ (۱۶) قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۲۱۲۔ (۱۷) ایضاً۔ (۱۸) تالیف شریفی، حکیم شریف خاں، مقدمہ، ص ۱۔ (۱۹) حوالۂ مذکور (برحاشیہ) ص ۳۔ (۲۰) اطبائے عہد مغلیہ، حکیم کوثر علی چاند پوری، ص ۵۰، ۵۱۔

مولانا آزاد کے بعض تفسیری امتیازات

از: ڈاکٹر ابوزاہد شاہ سید وحید اللہ حسینی القادری الملتانی

انسانی گروہ کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کے پیش نظر دنیاوی منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے، اس کے افکار ونظریات مادی زندگی تک محدود رہتے ہیں۔ وہ اخروی زندگی پر دنیوی حیات کو ترجیح دیتا ہے، جبکہ بنی نوع انسان کا دوسرا گروہ ایسا ہے جس کا منتہائے مقصود اخروی نجات ہوتا ہے، اس کی دنیوی زندگی پر کوئی نظر نہیں ہوتی وہ صرف دل وروح کی پاکیزگی، اور اصلاح نفس پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کرتے ہوئے تارکِ دنیا ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ ایک اظہر من الشّمس حقیقت ہے کہ دین اسلام میں جس طرح حب الدنیا کی مذمت کی گئی ہے اسی طرح رہبانیت کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان مادیت ومعنویت میں توازن برقرار رکھتے ہوئے دنیا وعقبی کی کامیابی وکامرانی حاصل کرے۔ جسمانی کاموں کے ساتھ روحانی امور کا پاس ولحاظ رکھنا یقیناً ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کشمکش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں بعض ہستیاں ایسی بھی گزری ہیں جو نہ صرف دین ودنیا میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے بلکہ مذہبی علوم اور دنیوی معاملات میں کارہائے نمایاں بھی انجام دیے ہیں، مولانا آزاد کا شمار انہی معدودے چند اشخاص میں ہوتا ہے۔ ”ترجمان القرآن“ جہاں ان کی مذہبی راسخ الاعتقادی کا مظہر ہے تو وہیں آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور صدر نیشنل کانگریس کی حیثیت سے ان کا تقرران کی دنیوی معاملہ فہمی پر دال ہے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸۔۱۹۵۸ء) مختلف الصفات والجہات شخصیت کے مالک تھے۔ فہم وفراست، ذہانت وفطانت، علمی فضیلت وعبقریت اور غیر معمولی عزم وہمت نے انہیں بیسویں صدی کے نصف اول کی عہد ساز شخصیت بنادیا۔ ان کی حیات مستعار کی ہر گھڑی خدمت خلق اور بنی نوع انسان کی بھلائی اور خیر خواہی میں گزری۔ پروفیسر رشید الدین خاں مولانا کی شخصیت کے تابناک وروشن پہلوؤں کا خاکہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اطلاق مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف اوصاف پر ہوسکتا ہے، مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی خطابت مثل بانگ دراتھی صحافت جیسے ضربِ کلیم، پرواز ذہنی جیسے بال جبرئیل، سماجی ادب واخلاق اور انداز نشست و برخواست جیسے رموز خودی، مسلمانوں کا درد اوران کی بے اعتنائیوں پر صبر جیسے رموز بے خودی اور مطمح سیاست جیسے پیامِ مشرق۔''(۱)

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی مولانا کی شخصیت کے بارے میں اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

''بلاشبہ وہ نابغہ روزگار، عمدہ یادداشت سے بہرہ ور، بڑے مفکر، مسحور کن بلاغت کے مالک اور قادر الکلام نثر نگار تھے۔ اُردو انشا پردازی میں وہ ایک نئے طرز کے موجد ہیں۔ میں نے ان کو بارہا دیکھا ہے اوران کی تقریریں سنی ہیں۔''(۲)

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''باضابطہ تعلیم اور اصلاحی تدریس مولانا کی بھی بعض اور مشاہیر ماضی وحال کی طرح کچھ ایسی زیادہ نہ تھی لیکن نہ معلوم کتنے مختلف علوم وفنون کے خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے اور ہر وقت مستحضر، طب ہو کہ الٰہیات، فقہ ہو کہ کلام، شعر وادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات، جس فن سے بھی متعلق، جو بھی موضوع ہو، بس گفتگو چھیڑنے کی دیر تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار ہی نہیں، ماہر فن تقریر کر رہا ہے اور تقریر بھی اس انداز کی دل آویز ومربوط کہ فصاحت وبلاغت بلائیں لیتی جارہی ہے''۔(۳)

بیسویں صدی کے متصادم تصورات، پُرآشوب حالات، اور ہلاکت آفریں مؤثرات کے باوجود مولانا کے حوصلوں کی بلندی اورعزائم کی پختگی مثالی تھی۔ وہ مساوات انسانی کے علمبردار تھے۔ مولانا کا اسلوب بیان انہیں معاصرین میں ممتاز ونمایاں کردیتا ہے۔ مولانا کی نثری خوبیوں کا زمانہ معترف ہے۔ حسرت موہانی فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا کے علمی وفنی کمالات اور قومی وملی فتوحات کی فہرست طویل ہے جس میں مولانا نے فنِ تفسیر میں اپنی خداداد صلاحیت واستعداد کا نقش بھی ثبت کیا۔

قرآن حکیم فطری جاذبیت اور رشد وہدایت کا ایسا منبع ومصدر ہے جو سلیم الطبع وسنجیدہ فطرت

انسان کو بیک وقت خدا شناسی، خود شناسی اور حقیقت شناسی کی تعلیم دینے کے ساتھ اس کی ظاہری و باطنی اصلاح کرتا ہے۔ اسی قرآنی تربیت کا فیضان ہوتا ہے کہ انسان شیطانی وساوس، نفسانی خواہشات، مادہ پرستی کی نحوستوں سے نکل کر عزت و عظمت کی بلندیوں اور انسانیت کے اُس اعلیٰ وارفع مقام پر فائز ہو جاتا ہے جہاں اس کا وجود ساری کائنات کے لیے آیۂ رحمت بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم اجمالاً و تفصیلاً علوم و فنون کا جامع ہونے کے باعث ایک طرف دانش و حکمت اور علم و معرفت کا وہ سمندر بیکراں ہے جس سے ہر انسان اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق تا قیامِ شمس و قمر اپنی علمی پیاس بجھاتا رہے گا تو دوسری طرف اس کلامِ ربانی میں انسانیت کی فلاح و صلاح کے جملہ عناصر موجود ہیں جس کو اپنا کر انسان اعلیٰ علیین کی منزل پر بہ آسانی فائز ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید زندہ جاوید کتاب ہے جو قیامت تک ہر عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ پیغامِ قرآنی ہر دور میں انسانی عقل و فہم کو لذتِ جستجو بخشتا رہے گا، کسی بھی خطہ کا انسان کسی بھی دور میں جب قرآن حکیم کا مطالعہ بنظر غائر کرے گا تو وہ اس کے اسلوب بیان و حقانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرآن حکیم وہ آخری آسمانی مقدس کتاب ہے جو بلا لحاظ مذہب و ملت، علاقہ و وطنیت، رنگ و قومیت ساری انسانیت کے لیے رشد و ہدایت کا خزینہ ہے۔ اس میں ہر شعبۂ زندگی کے لیے عملی ہدایات موجود ہیں، قرآن حکیم انتہائی فصیح و بلیغ عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ کلام الٰہی کے مطالب و مقاصد کی تفہیم قرآن کے اولین مخاطب یعنی اہل عرب کے لیے بھی بسا اوقات دشوار ہو جاتی تھی۔ صحابہ کرام آیات بینات کے اجمال کی تفصیل کے لیے بارگاہِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجوع ہوتے چونکہ رب کائنات نے قرآن حکیم کی تفسیر و ترجمانی کا منصب جلیلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تفویض کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ	اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کرے لوگوں کے لیے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ (۴)

انسان کی دنیوی و اخروی ترقی کا راز قرآنی ارشادات و تعلیمات میں مضمر ہے۔ علماء کرام نے قرآنی مطالب و مفاہیم سے ساری انسانیت کو روشناس کروانے کے لیے مختلف زبانوں میں قرآن حکیم کا ترجمہ و تفسیر بیان کرنے کا کام بڑی عرق ریزی سے انجام دیا۔ ان ہی کاوشوں کی ایک کڑی مولانا ابوالکلام

آزاد کی ام الکتاب اور ترجمان القرآن ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کے لیے علمائے کرام نے پانچ ماخذ کا ذکر کیا ہے: ۱۔ قرآن حکیم۔ ۲۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ۳۔ اقوال صحابہ کرامؓ۔ ۴۔ اقوالِ تابعینؒ۔ ۵۔ پانچواں ماخذ اسرائیلی روایات۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پانچواں ماخذ اسرائیلی روایات میں علمائے کرام کا اختلاف ہے جنھوں نے اسرائیلی روایات کو تفسیر قرآن کے لیے ماخذ تسلیم کیا ہے ان کا استدلال حسب ذیل حدیث شریف ہے جو سیدنا عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے:

> ''رسول اللہؐ نے فرمایا: ''مجھ سے آگے پہنچاؤ، خواہ (تمھیں) ایک آیت ہی (معلوم) ہو اور بنی اسرائیل سے بیان کرو، اس میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''(۵)

علماء کرام کا وہ طبقہ جو قرآن حکیم کی تفسیر میں اسرائیلی روایات کے استعمال کا مخالف ہے وہ ترجمان القرآن حضرت سیدنا ابن عباسؓ کے حسب ذیل قول سے دلیل لاتا ہے:

> ''اے مسلمانو! تم اہل کتاب سے کسی چیز کے متعلق کیوں پوچھتے ہو، حالانکہ تمہاری کتاب جو رسول اللہ پر نازل فرمائی گئی ہے، وہ نئی وتازہ ہے، تو اس کی تلاوت کرتے ہو، یہ خالص ہے اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے۔ پھر اللہ تعالی نے (اس کتاب میں) اہل کتاب کے بارے میں یہ بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف وتبدیلی کردی تھی، وہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر کہنے لگے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ وہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیوی منفعت) حاصل کرلیں۔ تمہارے پاس جو علم ہے کیا یہ تمھیں ان سے پوچھنے سے روکتا نہیں؟ اللہ کی قسم! ہم نے کبھی دیکھا کہ ان میں سے کسی شخص نے اس کے بارے میں تم سے پوچھا ہو جو تم پر نازل کیا گیا۔''(۶)

بعض علمائے کرام نے اسرائیلی روایات کے ضمن میں معتدل مزاجی سے کام لیا ہے۔ اگر کوئی اسرائیلی روایت کتاب وسنت کے موافق ہوتی ہے تو بیان کرتے ہیں، اگر مخالف ہوتی ہیں تو ترک

کرتے ہیں اور جن روایات سے متعلق کتاب وسنت خاموش ہیں، ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب، علامہ ابن کثیر بھی اسی مکتبِ فکر کے حامی نظر آتے ہیں چنانچہ انہوں نے اسرائیلی روایات کی حسب ذیل تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

۱۔مقبول یعنی ایسی اسرائیلی روایت جس کی تصدیق قرآن وحدیث سے ہوتی ہو جیسے غرقِ فرعون اور حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

۲۔مسکوت عنہ یعنی ایسی اسرائیلی روایت جس کے متعلق قطعی علم نہ ہو البتہ عبرت پذیری اور وعظ ونصیحت کی خاطر بیان کیا جاسکتا ہے۔جیسے بنی اسرائیل کے عبادت گزار بندوں کا تذکرہ وغیرہ۔

۳۔مرفوض یعنی ایسی اسرائیلی روایت جو شریعت مطہرہ کے بالکل مغائر ہو۔جیسے حضرت سیدنا سلیمان علیہ السلام کے بارے میں روایت ملتی ہے کہ آپؑ نے اپنے آخری ایام میں کفر اختیار کرلیا تھا، (نعوذ باللہ من ذلك) قرآن حکیم نے اس نظریہ کا بطلان کرتے ہوئے فرمایا ''وما کفر سلیمان'' اور اس طرح کی دیگر روایات۔(۷)

جہاں تک مولانا آزاد کا تعلق ہے وہ اپنی تفسیر میں زیادہ تر پہلے ماخذ یعنی قرآن حکیم کے استعمال ہی پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں، بعض مقامات پر انہوں نے احادیث نبویؐ کے حوالے دیے ہیں۔

مولانا آزاد کی تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دقتِ تعبیر اور عمیق فکر ونظر کی بجائے قرآنی مطالب ومعانی کو نہایت پُرکشش انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے قاری کو قرآنی مطالب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔انداز استدلال انتہائی سہل ہونے کے باوجود یہ تفسیر دقیق وعمیق حقائق و دقائق کی جامع ہے۔ام الکتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مولانا نے تفسیر کے لیے الفاظ کے لغوی حل کے ساتھ ساتھ ٹھوس علمی مباحث، منطقی دلائل، عام فہم امثلہ عربی، فارسی، اردو اشعار کا برمحل استعمال اور زبان وبیان کا ایسا سلیس وپُرکشش اسلوب اختیار فرمایا ہے جو ہر مکتب فکر کے لیے اعتقاداً وعقلاً قابل قبول تھا، کسی کے لیے مجالِ انکار نہیں۔مولانا کی تفسیر فاسد نظریات، ضعیف روایات اور غلو وبے جا حمایت سے تقریباً پاک ہے۔

جب انسانی ذہن میں یہ بات راسخ ہوجاتی ہے کہ دنیوی حیات ہی سب کچھ ہے تو وہ بنیادی ہدف کے طور پر اس سے عشق کرنے لگتا ہے پھر اس کی دنیوی آرزوؤں وتمناؤں کا دامن وسیع سے وسیع تر

ہوتا چلا جاتا ہے۔اس کی ساری تگ و دو کا مقصد عیش وعشرت تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ حرص ولالچ، مفاد پرستی، غیر انسانی اوہام وخرافات کا شکار ہوجاتا ہے۔حیوانی لذات اور مادی جذبات کی تسکین، پرتعیش زندگی بسر کرنے کا جذبہ اسے دوسروں کے حقوق غصب کرنے، خودستائی کے لیے تمام انسانی شرف اور حیثیت کو درہم ودینار کے بدلے فروخت کرنے پر آمادہ کردیتا ہے۔پھر رفتہ رفتہ معاشرے میں جنگیں، خون ریزیاں اور فسادات عام بات ہوجاتی ہے جس سے انسانی معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد ''الحمدللہ'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تحمید الٰہی کی تفہیم انسان کو اسی خطائی الفکر سے بچاتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اس راہ میں فکر انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہوکر رہ جاتیں، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتیں۔ وہ پردوں کے نقش ونگار کو دیکھ کر بے خود ہوجاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمال صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی، پس ''الحمدللہ'' کا اعتراف اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائناتِ ہستی کا تمام فیضان وجمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو، صرف ایک صانع حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے، اسی لیے حسن وجمال کے لیے جتنی بھی شیفتگی ہوگی۔خوبی وکمال کے لیے جتنی بھی مدحت طرازی ہوگی بخشش وفیضان کا جتنا بھی اعتراف ہوگا، مصنوع ومخلوق کے لیے نہیں ہوگا، صانع وخالق ہی کے لیے ہوگا۔(۸)

عموماً مفسرین، قرآنی الفاظ کو ایسے معانی کا جامہ پہناتے ہیں جو ان کے مسلک، اصول، تعلیمات، مزاج، ذوق اور افکار وآرا کی عکاسی کرتا ہے۔مثلاً:

سہل تستری نے تفسیر القرآن الکریم، ابوعبدالرحمن سلمی نے حقائق التفسیر، نجم الدین دایہ نے التاویلات النجمیہ کے نام سے تفسیریں لکھیں جن کو تفاسیر تصوف سے بھی تعبیر کیا گیا۔

فقہی اعتبار سے لکھی جانے والی تفاسیر کے چند نام یہ ہیں:

الجصاص کی احکام القرآن۔مقداد الیسوری کی کنز العرفان فی فقہ القرآن۔قرطبی کی الجامع الاحکام القرآن وغیرہ۔

تفسیر بالرائے المحمود کے زمرے میں حسب ذیل تفاسیر کا شمار ہوتا ہے:

امام رازی کی مفاتیح الغیب۔ بیضاوی کی انوار التنزیل واسرار التاویل۔ ابوحیان کی البحر المحیط۔

تفسیر بالماثور کے موضوع پر لکھی جانے والی تفسیروں میں درج ذیل شمار کی جاتی ہیں:

ابو اللیث سمرقندی کی بحر العلوم۔ جلال الدین سیوطی کی الدر المنثور۔ ابن جریر طبری کی جامع البیان فی تفسیر القرآن وغیرہ۔

مذکورہ بالا تفاسیر سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد محدود ہے چونکہ تفاسیر صوفیہ سے وہی لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جو تصوف کے اسرار ورموز سے واقف ہوں، تفاسیر فقہا کا مطالعہ انہی کے لیے سودمند ہوسکتا ہے جو فقہ اور اصول فقہ میں درک رکھتے ہوں، تفاسیر بالرائی المحمود انہی افراد کے حق میں مدد ومعاون ثابت ہوتی ہیں جنہیں فکر سلیم کا وافر حصہ ملا ہو، جو عقل وخرد کے محاسن ومعائب سے اچھی طرح واقف ہوں، تفسیر بالماثور سے انہی کے ذوق کی تسکین ہوتی ہے جو علم، اصول اور مصطلحات حدیث سے شغف رکھتے ہیں۔

مولانا آزاد کی تفسیر کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے پیچیدہ علمی مطالب ومفاہیم کو عمومی سطح تک عام اور وسیع کرنے کے لیے مناسب مثالوں کا استعمال کیا ہے۔ مسائل عقلیہ کو سمجھانے کے لیے معقول کو محسوس سے تشبیہ دینا بے حد مدد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ حقائق کی وضاحت اور مطالب کو دل نشین بنانے میں امثلہ کی اہمیت وافادیت اور اثر آفرینی سے کوئی فرد انکار نہیں کر سکتا۔

ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا	بیشک اللہ حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی۔(۹)

مچھر جسامت کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہوتا ہے لیکن اس میں نہ صرف خشکی کے بڑے جانور یعنی ہاتھی کے تمام اعضا وجوارح پائے جاتے ہیں بلکہ اس کے پاس سینگ اور پر بھی ہوتے ہیں جو ہاتھی کے پاس نہیں ہیں جب انسان اس مچھر کی تخلیق کی خوبی وعمدگی پر غور وفکر کرتا ہے تو انسان کے دل ودماغ پر خالق کی عظمتوں کا نقش ثبت ہوجاتا ہے۔

بعث بعد الموت کے تصور کو مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ	اور جس نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق، پس ہم نے زندہ کردیا اس سے ایک مردہ شہر کو یونہی تمہیں بھی (قبروں سے) نکالا جائے گا۔(۱۰)

یعنی جس طرح پانی کی وجہ سے مردہ زمین زندہ ہوجاتی ہے اسی طرح انسان کو مردہ ہونے کے بعد قبروں سے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔

بسا اوقات ایک چھوٹی وموزوں مثال کئی فلسفیانہ دلائل کے مقابل بہت زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے جس سے عام فہم انسان بھی بہ آسانی استفادہ کرسکتا ہے۔اسی لیے مولانا آزاد نے قرآنی مقاصد کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ایسی مثالوں کا انتخاب فرمایا ہے جو قامت مطالب اور مقتضائے حال کے لیے بالکل موزوں ومناسب ہوتی ہیں۔مولانا آزاد کی بیان کردہ مثالوں کی منطق کا ادراک ہر سطح کا انسان بہ آسانی کرسکتا ہے،بطور مثال مولانا کی تفسیر ’’ام الکتاب‘‘ سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم نے اللہ کی توصیف رب العالمین سے فرمائی ہے، چونکہ خدائی پرورش خداشناسی کا بہترین ذریعہ ہے۔علمائے کرام رب کے معنی بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

تبلیغ الشئی الی کمالہ بحسب استعدادہ الازلی شیئاً فشیئاً	کسی چیز کو اس کی ازلی اِستعداد وفطری صلاحیت کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبۂ کمال تک پہنچانا۔(۱۱)

ربوبیت کے اسی مفہوم کو مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے مولانا آزاد رقمطراز ہیں:

> ’’ربوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کردیا گیا ہے۔بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں یہ پرورش محبت وشفقت حفاظت ونگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک بچہ اپنے جسم وذہن کی حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے پھر پرورش کی ضرورت، ایک دو نہیں، بےشمار ہیں، ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ اور زندگی کا سروسامان ملتا رہے۔حکمت الٰہی نے ماں

کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کردیے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریاتِ پرورش کا سروسامان مہیا کرتی رہتی ہے۔

جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہی اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے۔" (۱۲)

مولانا آزاد مذکورہ بالا مثال بیان کرنے کے بعد قاری کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ اور ربوبیتِ الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کرو۔ جب انسان اس مثال پر نظر ڈالتا ہے تو اسے واقعی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ خدا کے متعدد انعامات، نوازشات، احسانات، بخشائش و کرم فرمائیوں سے استفادہ کر رہا ہے جس کو حد و شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر انسان کا لعابِ دہن (یعنی تھوک) جس سے انسان کراہیت کرتا ہے اگر یہ پیدا ہونا بند ہو جائے تو انسان کی زبان لکڑی کی طرح خشک ہو کر رہ جائے گی۔

تاریخ ادیان و مذاہب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں لوگ ارباب انواع (یعنی متعدد معبودوں) کے قائل رہے ہیں۔ نوعِ انسانی کی اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے رب کائنات نے انبیا و مرسلین کو مبعوث فرمایا ہے۔ انسان کے تمام اعمال صالحہ کا مدار اسی تصور توحید پر منحصر ہے۔ تصور توحید پر نظام ربوبیت سے استدلال کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالوگے تو صاف نظر آئے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقہ سے سامانِ پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جا رہے ہیں۔ انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمہاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں

ہیں؟ لیکن اگر ان کی نشوونما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھو گے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے''۔(۱۳)

ایمانیات کے باب میں آخرت پر ایمان لانا بہت زیادہ مہتمم بالشان ہے۔ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر انسان کو ذمہ دار مخلوق قرار دیا ہے جو اپنے ہر عمل کے لیے بروز محشر جواب دہ ہوگا۔ مولانا آزاد جزا و سزا کے دن کی حقانیت کو مثال سے واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانونِ مکافات رکھتی ہے ممکن نہیں کہ اس میں تغیر وتساہل ہو، فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے اب سوزش وتپش فطرت کی وہ مکافات ہوگئی جو ہر اس انسان کے لیے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دے گا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کودو اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے یعنی ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہیں جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے، اب ممکن ہے کہ تم دریا میں اترو اور اس مکافات سے بچ جاؤ پھر جو فطرت کائناتِ ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے۔ کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لیے مکافات نہ رکھے یہی مکافات جزا وسزا ہے۔ آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، دودھ سے طاقت آتی ہے جب اشیا کی ان تمام مکافات پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا تو پھر اعمال کی مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟''(۱۴)

مذکورہ بالا دلائل و براہین کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد طبقۂ مفسرین میں ایسے منفرد مفسر ہیں جنھوں نے معقولات کو محسوسات میں تبدیل کرنے کی جستجو وسعی کی ہے۔

حواشی

(۱) رشید الدین خاں، مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت سیاست اور پیغام۔ (۲) حیات ابوالمآثر صفحہ نمبر ۶۴۷۔ (۳) آئینۂ ابوالکلام آزاد، صفحات ۵۳ تا ۵۴۔ (۴) سورۃ النحل آیت نمبر ۴۴۔ (۵) بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر ۳۴۶۱۔ (۶) بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لا تسئلوا اھل الکتاب عن شئی، حدیث نمبر ۷۳۶۳۔ (۷) مقدمہ تفسیر ابن کثیر صفحہ نمبر ۲۶۔ (۸) ام الکتاب، صفحہ نمبر ۲۵۔ (۹) سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۶۔ (۱۰) سورۃ الزخرف آیت نمبر ۱۱۔ (۱۱) روح المعانی۔ (۱۲) ام الکتاب، صفحات ۳۰ تا ۳۱۔ (۱۳) ام الکتاب، صفحہ نمبر ۳۸۔ (۱۴) ام الکتاب، صفحات ۱۶۰ تا ۱۶۱۔

بیان شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی سیرت و شخصیت اور ان کے عظیم الشان علمی و تصنیفی کارناموں کا دائرہ اس قدر وسیع ،متنوع اور گونا گوں ہے کہ آٹھ سو صفحات کی ان کی سوانح عمری ''حیات شبلی'' اور ایک درجن سے زائد مستقل کتابوں اور سیکڑوں مضامین و مقالات میں بھی وہ کافی نہ ہو سکا اور ایک صدی گذر جانے کے باوجود آئے دن شبلیات کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو اور نیا گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ راقم نے اپنی متعدد تصنیفات میں باقیات شبلی کو سمیٹنے اور یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادھر علامہ شبلی سے متعلق متعدد نئی معلومات اور ان کی چند نادر اور بیش قیمت تحریریں بھی دستیاب ہوئیں۔ یہاں انہیں کو یکجا کیا گیا ہے۔ یقین ہے یہ سلسلہ ابھی اور دراز ہوگا۔

نوادر کے پارکھ: علامہ شبلی اپنے عہد میں نادر کتابوں پر گہری نظر رکھنے والے ایک بڑے مصنف تھے۔ خاص طور پر اسلامی علوم و فنون کی اہم اور نادر کتابیں ان کی نظر میں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ کتابوں کے بڑے شائق اور دلدادہ تھے۔ دوسری یہ کہ تحقیق و تصنیف ان کا مشغلہ تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ کتب خانوں سے عام تعلق رکھتے تھے۔ وہ جب ۱۹/سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، ۱۸۹۲ء میں جب وہ قسطنطنیہ اور روم و مصر و شام کے سفر پر گئے تو وہاں کے متعدد کتب خانوں کے نوادرات سے استفادہ کیا۔ مصر کا مشہور کتب خانہ خدیو بھی دیکھنے گئے۔ قسطنطنیہ میں کتب خانے دور دور واقع تھے، چنانچہ ان کتب خانوں میں پاپیادہ جا کر کتابوں کا مطالعہ کیا۔ نوٹس لیے اور متعدد کتب کاتبوں سے نقل کرائیں، اسی طرح ہندوستان کے تمام اہم کتب خانے ان کی نظر میں تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ سے اس قدر استفادہ

رفیق اعزازی دارالمصنّفین اعظم گڑھ، موبائل: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵۔

کیا کہ ۱۹۰۶ء میں اس کے فیلو منتخب ہوئے۔مولانا حبیب الرحمٰن شروانی (۱۸۶۲-۱۹۵۰ء)اور نواب سید علی حسن خاں (۱۸۶۶-۱۹۳۶ء) کو بھی ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو انہی نے نامزد کرایا۔ کتب خانہ رامپور سے ان کی حد درجہ دلچسپی کے سبب نواب رام پور نے ان سے کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کی فرمائش کی جس کا خاکہ انہوں نے بنا کر پیش کیا اور جس پر عمل کیا گیا۔اسی طرح خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور مولوی خدا بخش خاں (۱۸۴۲-۱۹۰۸ء) سے بھی ان کے گہرے روابط تھے۔اس کی اہمیت پر ان کی ایک تحریر بھی ''مقالات شبلی'' میں شامل ہے۔اس سے متعلق وی،سی،اسکاٹ اوکونز نے جو کتاب لکھی ہے اور جس کا ترجمہ سید مبارزالدین رفعت نے ''ایک مشرقی کتب خانہ'' کے عنوان سے کیا ہے۔اس کے آغاز میں سر سید علی امام (۱۸۶۹-۱۹۳۲ء) کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔اس میں علامہ شبلی کی نوادر پر گہری نظر کا ذکر ہے۔وہ اقتباس یہ ہے:

> ''خدا بخش مرحوم بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے اور قدیم اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔انہیں دیکھ کر مجھے وہ تصویریں یاد آجاتی تھیں جو داستان الف لیلہ کی ایک مصور جلد میں میں نے کہیں دیکھی تھیں۔عجیب اتفاق ہے جب میں پہلی بار ان سے ملا ہوں اسی دن ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شبلی نعمانی سے بھی میری ملاقات ہوگئی جو اس وقت خدا بخش مرحوم کے مہمان کی حیثیت سے ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے،ہم سب نے مل کر ایک کھلے میدان میں چائے پی۔ یہاں سے لہلہاتی فصلوں کے بڑے بڑے کھیت نظر آتے تھے۔ان کے پرے دریائے گنگا کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ ان کا نایاب خزانہ بہترین قلمی کتابوں کی صورت میں مولانا شبلی نعمانی کے ملاحظہ کے لیے پھیلا ہوا تھا۔اور مولانا ایسی چیزوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ایک کے بعد دوسری نایاب و نادر کتاب اٹھائی گئی اور اس کا معائنہ ہوتا رہا۔جب تک یہ شغل جاری رہا میں گویا مبہوت و مسحور انہیں بیٹھا دیکھتا رہا۔ نادر چیزوں کے جمع کرنے کا فخر،انہیں کا جوش وخروش اور قدیم چیزوں کی محبت سے خدا بخش مرحوم کا چہرہ دمک رہا تھا۔کچھ ایسی ہی کیفیت مولانا شبلی نعمانی کے چہرہ سے جھلکتی تھی جو اس وقت مجھے اسلامی تہذیب اور علمی تبحر کا مجسمہ نظر آتے تھے۔''(۱)

قوم پر اثر: مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (۱۸۹۷-۱۹۷۶ء) نے لکھا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) نے جب دہلی میں نظارۃ المعارف قائم فرمایا تو تھانہ بھون آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) سے ملا تو مسلمانوں کی عام بے راہ روی اور پریشانی اور مبتلائے آفات ہونے کا تذکرہ ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں قوم کی اصلاح کی تدبیر کیا ہے؟ علامہ شبلی نے کہا کہ:

> ''قوم کی اصلاح صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کا قوم پر مکمل اثر ہو اور یہ اثر بغیر تقدس کے نہیں ہو سکتا اور تقدس بغیر تقویٰ اور کثرت عبادت و ذکر اللہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔'' (۲)

مولانا عبید اللہ سندھی اور علامہ شبلی میں مراسم اور مراسلت تھی۔ علامہ شبلی ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔ ''سیرۃ النبیؐ'' کی تالیف کے زمانہ میں جب واویلا مچایا گیا اور عدم اعتماد کا اظہار کیا تو اعتماد قائم کرنے کے لیے علامہ شبلی نے مسودہ ''سیرۃ النبیؐ'' انہیں مولانا عبید اللہ سندھی کے توسط سے مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) کی خدمت میں بھیجا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے مسودہ دیکھنا منظور نہیں کیا۔ (۳)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بزرگ ملک و ملت کے مسائل پر آپس میں غور و فکر بھی کرتے تھے۔

مجموعہ نظم شبلی اردو: علامہ شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی سیاسی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں ان کی اخیر زندگی میں بے حد مقبول ہوئیں۔ چنانچہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) ناشرین نے لکھنو، دہلی، بمبئی اور لاہور وغیرہ سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع کیے۔ مذکورہ بالا عنوان سے دہلی کے دو ناشرین سید ظہور الحسن موسوی اور منشی سید قربان علی بسمل نے اس مجموعہ کے کئی ایڈیشن چھاپے۔ اسی عنوان سے ۱۹۲۸ء میں ایک ایڈیشن مدینہ اخبار بجنور کے مدیر مولوی مجید حسن (م: نومبر ۱۹۶۶ء) نے اپنے مدینہ پریس بجنور سے بھی شائع کیا تھا۔ جو ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور طباعت بہت صاف ستھری ہے۔ دہلی اور بجنور ایڈیشن میں یہ فرق ہے کہ دہلی والے ایڈیشن میں

علامہ شبلی کے کلام کے ساتھ ان کے مختصر حالات اور مولوی عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰-۱۹۲۶ء) کا وفیاتی مضمون بھی شامل ہے جبکہ بجنور ایڈیشن اس سے خالی ہے۔

الفاروق - فارسی ترجمہ: ''الفاروق'' علامہ شبلی کی مقبول ترین کتاب ہے۔اس کا ایک فارسی ترجمہ نادر خاں شاہ افغانستان کی بہن علیا جناب نے کیا تھا جو افغانستان سے زمانہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ حال ہی میں اس کا ایک اور فارسی ترجمہ ''زندگی فاروق اعظم عمر بن خطابؓ'' نظر سے گذرا، جو ایران سے شائع ہوا ہے۔مترجم کا نام عبداللہ پاسالاری ہے۔۵۳۶ صفحات پر مشتمل اس ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے،اس کی قیمت چار سو ریال ہے۔آن لائن بھی دستیاب ہے۔

الفاروق - سندھی ترجمہ: ہمارے ایک کرم فرما جناب عبدالغنی دایو نے سندھ سے الفاروق کا سندھی ترجمہ بطور تحفہ بھیجا ہے۔اس کے مترجم انجینئر عبدالمالک میمن ہیں۔اسے فروری ۲۰۱۶ء میں مہران اکیڈمی شکار پور پاکستان نے شائع کیا ہے۔یہ ۳۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ۳۵۰ روپے ہے۔آخر میں مہران اکیڈمی شکار پور کی فہرست مطبوعات دی گئی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک فعال ادارہ ہے اور اس نے متعدد اردو کتابوں کے سندھی ترجمے شائع کیے ہیں۔جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا علی میاں اور طالب الہاشمی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

یہ سندھی ترجمہ الفاروق کا دوسری زبانوں میں دسواں ترجمہ ہے۔

الفاروق - ہندی تراجم: ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے الفاروق سمینار میں راقم نے ''الفاروق کے تراجم'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔اس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسے ملکی زبان ہندی کا جامہ پہنایا جائے۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم ناظم دارالمصنّفین وہاں موجود تھے۔انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس سے اصل اردو ایڈیشن کی اہمیت کم ہوگی مگر پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے یہ کہہ کر کہ اب خود مسلمانوں کو ہماری کتابوں کی ہندی میں ضرورت ہے بات ختم کر دی تھی، ۱۴؍سال بعد ۲۰۱۶ء میں خود دارالمصنّفین نے الفاروق کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے۔اس کے مترجم جناب عبداللہ دانش ہیں۔یہ ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔الفاروق کا دوسرا ہندی ترجمہ اعظم گڑھ کے ایک ممتاز وکیل جناب فیض احمد ایڈوکیٹ نے کیا ہے۔اس کے ناشر بھی وہی ہیں۔۲۰۷ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔

اب تک ''الفاروق'' کے گیارہ زبانوں میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

سوانح مولانا روم: ''سوانح مولانا روم'' کی اہمیت کے پیش نظر ایران کے ایک عالم اور مشہور شبلی شناس سید محمد تقی فخر داعی گیلانی (۱۸۸۱ - ۱۹۶۴ء) نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو ۱۳۳۲ھ ش میں تہران ایران سے شائع ہوا۔ حال ہی میں اس کا ایک پشتو ترجمہ دستیاب ہوا ہے۔ اس کا پشتو نام ''مولانا وافکاراو'' ہے۔ مترجم کا نام حافظ رابعہ تورستانی ہے۔ انہوں نے تقدیم میں ''سوانح مولانا روم'' کی اہمیت اور پشتو ترجمہ کے اسباب بیان کرنے کے ساتھ علامہ شبلی کے مختصر حالات زندگی اور کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اہمیت کے پیش نظر مترجمہ نے سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کا فارسی مقدمہ بھی شامل کتاب کیا ہے، یہ ترجمہ ۲۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے ۳۲ صفحات ابجد شماری کے تحت ہیں، جبکہ متن کتاب کے ۲۰۳ صفحات ہیں۔ اسے مرکز نشرات سعید۔ دیلی منور شاہ قصہ خوانی بازار پشاور پاکستان نے شائع کیا ہے۔

اس سے پہلے علامہ شبلی کی دو اور مشہور کتابوں ''الفاروق'' اور ''سیرۃ النبیؐ'' کے پشتو ترجمے شائع ہوئے تھے۔ ''سیرۃ النبیؐ'' کے پشتو زبان میں تین ترجمے ہوئے ہیں۔

سیرت الصدیقؓ: علامہ شبلی کے نام سے یہ کتابچہ فاروقی کتب خانہ ملتان پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ولادت سے وفات تک کے مختصر حالات ہیں۔ یہ علامہ شبلی کی کسی کتاب کا اقتباس کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

سیرت علیؓ: علامہ شبلی سے منسوب اس کتابچہ کو بھی فاروقی کتب خانہ ملتان پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اس میں بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے مختصر حالات از ولادت تا وفات درج ہیں۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

غزوۂ بدر: علامہ شبلی نے ''سیرۃ النبیؐ'' میں غزوہ بدر پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ غزوۂ بدر کے متعلق علامہ شبلی کی رائے عام مورخین اور سیرت نگاروں سے مختلف ہے، چنانچہ ان کے موقف پر متعدد تنقیدیں بھی سامنے آئیں۔ یہ کتابچہ ''سیرۃ النبیؐ'' کے غزوہ بدر کے مباحث پر مشتمل ہے، اسے اسلامی پبلشنگ کمپنی اندرون لوہاری دروازہ لاہور پاکستان نے شائع کیا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

شبلی کی حیات معاشقہ ممنوع: ڈاکٹر وحید قریشی (۱۹۲۵-۲۰۰۹ء) کی کتاب ''شبلی کی حیاتِ

معاشقہ'' نے علامہ شبلی کی شخصیت کو الگ انداز میں پیش کیا تھا۔ مگر اس سے خود مصنف کی بدنامی ہوئی تو انہوں نے اس کتاب کو اولاً کتب خانوں سے غائب کرایا اور پھر اس کی اشاعت ہی کو ممنوع قرار دے دیا، ڈاکٹر انور سدید مرحوم (۱۹۲۸۔۲۰۱۶ء) کے ڈاکٹر وحید قریشی سے گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی وفات پر ''کچھ وقت ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ'' کے عنوان سے ماہنامہ الحمراء لاہور دسمبر ۲۰۰۳ء میں ایک مضمون لکھا۔ اس میں انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی کتاب کو ممنوع اشاعت قرار دے دیا تھا اور جب اس کا دوسرا ایڈیشن عرفان احمد نے شائع کیا تو وہ خوش نہیں ہوئے بلکہ اسے بے محل اور ناواجب قرار دیا۔ (۵)

علامہ شبلی اور مرزا دبیر: علامہ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر انیس و دبیر کو زندہ جاوید کر دیا۔ مگر دبیریوں نے یہ کہہ کر کہ اس میں دبیر کی حق تلفی کی گئی ہے، اس کے خلاف ایک طوفان برپا کیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ردالموازنہ، تردید الموازنہ اور المیزان جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ بنارس کے ایک شاعر مرزا محمد حسن فائز بنارسی (۱۸۵۶۔۱۹۲۹ء) نے یہ قطعہ کہہ ڈالا:

کس درجہ ہوں ناچیز اور حقیر اے فائز — بات اپنی نہیں ہے دل پذیر اے فائز
گویا زمانہ مولوی شبلی ہے — میں ہوں ہمہ تن نظم دبیر اے فائز (۶)

ایک غلط بیانی کی تردید: ''مولانا شبلی کی تاریخی نظم کی بازیافت'' کے عنوان سے حفیظ الرحمٰن خاں نے ایک مضمون لکھا ہے، جو ماہنامہ الحمراء لاہور ستمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔ جسے جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے مطالعہ کے لیے بھیجا ہے، مضمون نگار نے علامہ شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''شبلی نعمانی فارسی اور اردو کے باکمال شاعر بھی ہیں۔ وہ اردو میں قومی شاعری کے بانی ہیں۔ مولانا حالی نے سرسید کے اصلاحی نقطہ نظر کی روشنی میں قوم کو جگانے والی شاعری کی۔ ان کا دل ماضی سے ضیاء پاتا ہے۔ ان کی نگاہ جدید افکار سے خیرہ تھی، لیکن شبلی اپنی نظم و نثر کے ذریعے دوش کے آئینے میں فردا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں، جن بنیادوں پر علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں نے قومی شاعری کا قصر تعمیر کیا اس کی خشت اول مولانا شبلی نے رکھی۔ اقبال کی شاعری حکمت و بصیرت کے وسیع ترافق کی پہنائیوں کی خبر لاتی ہے۔ ظفر علی خاں کی شاعری ہنگامہ امروز سے

جلا پاتی ہے۔شاعری میں ہنگامی موضوعات کو بے ساختہ زبان شعر میں ادا کرنے کا
آغاز بھی مولانا شبلی نے کیا جوظفر علی خاں کا طرہ امتیاز ہے۔‘‘(۷)

مضمون نگار کے استاذ نور محمد خاں صدر مدرس گورنمنٹ کمپری ہائی اسکول ملتان بھی علامہ شبلی کے عقیدت کیش تھے۔انہیں علامہ شبلی کی ایک نظم جس کا مصرعہ اولیٰ:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہے غرور

ہے،انہیں زبانی یادتھی اوراسے وہ اکثر سنایا کرتے تھے،مذکورہ بالا مضمون میں مضمون نگار نے اپنے استاذ نور محمد خاں کے حوالہ سے اس نظم کو نقل کیا ہے اور اسے ایک بازیافت قرار دیا ہے۔حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کی یہ نظم ان کی وفات کے بعد پہلے زمیندار لاہور میں مولانا ظفر علی خاں نے شائع کی۔ پھر ۱۹۱۶ء میں ان کے کلیات میں شائع ہوئی،جس کے بیسیوں ایڈیشن ہندو پاک سے شائع ہو چکے ہیں،مضمون نگار اگر ایک بار بھی ’’کلیات شبلی‘‘ دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے تو اسے بازیافت نہ قرار دیتے اور اس کے متن میں جو متعدد اغلاط راہ پا گئے ہیں ان سے بھی یہ نظم پاک ہوجاتی۔مضمون نگار نے اپنے استاذ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ’’انہوں نے بیان کیا کہ ۱۹۱۳ء کے اواخر میں اور ۱۹۱۴ء کے آغاز میں انگلستان اور جرمنی کے تعلقات میں شدید بگاڑ پیدا ہوگیا۔یورپ عملاً دوحصوں میں تقسیم ہوگیا اور طبل جنگ بجنے کو تھا۔یہ صورت حال ستمبر ۱۹۱۴ میں جنگ عظیم اول کے آغاز پر منتج ہوئی،ہندوستان کے اہل درد جن میں علامہ شبلی پیش پیش تھے،اس وقت کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔چنانچہ انہوں نے انہی دنوں نئ نظم کی صورت میں تبصرہ کیا جو بلاعنوان ان کے رسالے غالباً الندوہ میں شائع ہوگئی۔اس پر ہندوستان کے انگریز حاکموں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔مولانا کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔الندوہ کی تمام کاپیاں ضبط کر کے نذر آتش کردی گئیں۔مولانا کچھ عرصہ انگریز کی جیل میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔تقریباً تین ماہ بعد ضمانت پر رہا ہوئے۔اس کے بعد مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی لیکن پیشی کی تاریخ سے چند روز قبل شدید علالت کی حالت میں وفات پائی۔اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔بعض نام نہاد محققین مولانا کی

وفات کو بندوق چل جانے کا شاخسانہ بیان کرتے ہیں، لیکن بندوق کی گولی لگنے کا واقعہ پہلے کا ہے، جس کے نتیجے میں ان کا پاؤں کاٹ دیا گیا تھا اور زخم ٹھیک ہوگیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ انگریزوں نے مولانا کی نظم کو بغاوت پر محمول کیا۔ انہیں جیل میں اذیت دی گئی، جس کے نتیجے میں وہ مقدمے کی پیشی سے چند روز قبل انتقال کر گئے۔"(۸)

حفیظ الرحمٰن خاں کا یہ مضمون ماہنامہ الحمراء، لاہور ستمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قید و بند، رہائی اور انگریزوں کے اذیت ناک رویہ کا تذکرہ، عدالت، پیشی، سب فرضی باتیں ہیں۔ مضمون نگار پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ اس نے ایک بار بھی "حیات شبلی" کا مطالعہ کیا اور نہ دیگر کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

علامہ شبلی اور شیخ محمد: علامہ شبلی سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے ملک و بیرون ملک کے اہل علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مشہور ایرانی مترجم سید محمد فخر داعی گیلانی (۱۸۸۱۔۱۹۶۴ء) جنھوں نے علامہ شبلی کی متعدد کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، وہ بھی علامہ شبلی سے بمبئی میں ایک ملاقات ہی میں ان کے گرویدہ ہوئے تھے۔ حال ہی میں ایک کتاب "روزنامچہ سیاحت" سے معلوم ہوا کہ ایران کے ایک بڑے اہل علم شیخ محمد رئیس محکمہ تمیز یہ جو عرصہ تک ہندوستان اور حیدر آباد میں مقیم رہے، ان سے بھی علامہ شبلی کے بڑے مراسم تھے اور اکثر دونوں میں ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ہمیں اس کا علم "روزنامچہ سیاحت" سے ہوا۔(۹) جس میں اس واقعہ کا ذکر ۵/ اگست ۱۹۱۱ء کے ذیل میں آیا ہے۔ یہ تفصیل ایک اسکالر ڈاکٹر لیلیٰ عبدی نے ایران سے بھیجی ہے۔

وجہ التفات: خواجہ غلام السیدین (۱۹۰۴۔۱۹۷۱ء) نے خواجہ غلام الثقلین (۱۸۷۲۔۱۹۱۵ء) کی شخصیت اور سوانح پر "مرد درویش" کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے عہد شبلی میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ ان کا نام تحریک علی گڑھ کے ممتاز اشخاص میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلی ان کی طرف کیوں اور کس طرح متوجہ ہوئے، اس کے بارے میں خواجہ غلام السیدین نے لکھا ہے کہ:

"جب وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تو مولانا شبلی کالج کے لائبریرین تھے۔(۱۰) وہ دیکھتے کہ ایک نوجوان طالب علم تقریباً ہر روز آتا ہے، لائبریری سے ایک کتاب لیتا ہے اور اگلے دن اسے واپس کر دیتا ہے۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید یہ

نوجوان خواہ مخواہ کتابیں لے جاتا ہے، پڑھتا وڑھتا نہیں، پوچھا تو اس نے کہا جی نہیں میں تو ہر کتاب پڑھ کر واپس کرتا ہوں۔ مولانا کو بہت تعجب ہوا اور انہوں نے چند کتابوں کے بارے میں سوال کیا تو اندازہ ہوا کہ اس نوجوان کا یہ خلاف قیاس بیان بالکل صحیح ہے۔ اس وقت سے مولانا شبلی ان پر خاص طور پر مہربان ہو گئے تھے اور یہ خلوص کا رشتہ ان کے انتقال تک قائم رہا۔"(۱۱)

ندوہ سے علامہ شبلی کا استعفیٰ اور بے چینی: اخبار زمیندار کے ذریعہ جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ علامہ شبلی نعمانی نے دارالعلوم کے عہدہ سکریٹری سے استعفیٰ دے دیا ہے تو ایک عام بے چینی پھیل گئی اور رنج و قلق کی کوئی حد نہ رہی۔ ہر شخص ان خطرناک نتائج کا انتظار کرنے لگا جو قدرتاً اس واقعہ کے بعد ظاہر ہوں گے۔ ان خطرات کو محسوس کر کے مدرسین وطلبائے دارالعلوم نے مناسب خیال کیا کہ ایک عام اجتماعی آواز کے ذریعہ اپنے رنج وغم کا اظہار کریں اور علامہ ممدوح سے درخواست کریں کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ چنانچہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۳ء کو دارالعلوم کے ہال میں ایک جلسہ زیر صدارت شمس العلماء مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی پرنسپل دارالعلوم مدرسین وطلبہ کا منعقد ہوا، جس میں نہایت جوش وخروش سے مولانا شبلی کے ایثار نفس اور ان کی بیش بہا خدمات کا اعتراف کیا گیا اور مندرجہ ذیل رزولیشن پُرآب آنکھوں اور مضطرب دلوں کے ساتھ بالاتفاق پاس ہوئے۔

۱۔ ہم مدرسین وطلبائے دارالعلوم مجلس انتظامیہ کی خدمت میں بہ ادب ملتمس ہیں کہ شمس العلما مولانا شبلی صاحب نعمانی کی گذشتہ خدمات اور آئندہ توقعات پر نظر کر کے ان کا استعفیٰ واپس فرما دیا جاوے۔

محرک: شمس العلماء مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب پرنسپل دارالعلوم۔

موید: مولوی مسعود علی صاحب، مولوی خلیل احمد صاحب عرب، مولوی معین الدین احمد صاحب۔

۲۔ ہم مدرسین وطلبائے دارالعلوم جناب شمس العلما مولانا شبلی صاحب نعمانی کے استعفیٰ پر دلی رنج اور تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور مولانا موصوف کی خدمت میں باادب ملتمس ہیں کہ ہم لوگوں کی حالت پر رحم فرما کر اپنا استعفا واپس فرما لیں۔

محرک: حاجی معین الدین صاحب بہاری۔

موید: مولوی محمد حسن صاحب، مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب۔

۳۔ مذکورہ بالا رزولیشن کی نقل انگریزی اور اردو اخبارات میں روانہ کی جائے۔

محرک: جناب مولانا سید علی صاحب ادیب دارالعلوم۔

موید: مولوی عبدالسلام صاحب (ندوی)، مولوی عبدالرحمٰن صاحب نگرامی، مولوی عبدالجلیل صاحب پشاوری۔

جلسہ مذکورہ میں اس خبر کا بھی ذکر ہوا جو مولانا سید محمد عبدالحی صاحب نائب ناظم اور منشی محمد احتشام علی صاحب معتمد مال کے استعفے کے متعلق مشہور ہوئی ہے، جس پر اظہار افسوس کیا گیا اور مجلس انتظامیہ سے یہ درخواست کرنے کی سفارش کی گئی کہ ان ہر دو حضرات کے استعفے بھی نامنظور فرمائے جاویں۔

(راقم معین الدین صاحب بہاری متعلم درجہ تکمیل دینیات)

مندرجہ بالا واقعہ صحیح ہے۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی پرنسپل دارالعلوم۔ (۱۲)

ندوہ میری تمام زندگی کا مرکز: علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر ابھی حال ہی میں مشہور مصنف جناب احمد سعید صاحب لاہور کو دستیاب ہوئی تھی انہوں نے از راہ علم دوستی ہمارے پاس بھیجی ہے۔ جناب احمد سعید صاحب کی برصغیر کی تاریخ پر بڑی گہری نظر ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر کئی اہم کتابیں لکھی ''روزنامہ پیسہ اخبار اور تحریک آزادی''، ''مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی'' اور ''بزم اشرف کے چراغ''، وغیرہ لکھی ہیں اور آج بھی سرگرم عمل ہیں۔

علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر ان کے شکریہ کے ساتھ یہاں درج کی جاتی ہے۔ یہ دراصل ایک مراسلہ ہے جو علامہ شبلی نے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار لاہور کو لکھا تھا، جس میں انہوں نے ندوہ سے اپنے استعفیٰ پر اظہار خیال کیا ہے:

> ''میں نے ندوہ کی معتمدی سے جو استعفیٰ دیا ہے اس سے عام لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ میں ندوہ سے بے تعلق ہو گیا ہوں۔
>
> استعفیٰ کے بعد سے چونکہ میں نے بالکل سکوت و خاموشی اختیار کی حالانکہ اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے استعفاء کے بعد ندوہ کی موجودہ اور آئندہ حالت پر ایک مفصل تحریر شائع کرتا، جس سے وہ خیال قوت پکڑتا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ندوہ میری تمام زندگی کا مرکز ہے۔ میں اس سے کسی طرح کبھی الگ نہیں ہو سکتا، البتہ ان

دنوں بہ وجہ مصروفیت تالیف سیرت نبویؐ اور ضعف وعلالت ندوہ کے علمی کاموں میں
حصہ نہ لے سکا، لیکن عنقریب ایک مستقل تحریر شائع کرسکوں گا، جس سے صحیح حالات
کا انکشاف ہو۔ میرے طریق عمل میں تفصیل سے بتاسکوں گا کہ ندوہ تمام قوم کا
مشترکہ کام سمجھا جاسکتا ہے۔ ندوہ کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ ابھی تک اس میں
قوم کی پوری طاقت شریک نہیں ہے۔ دیوبند کے علماء ابتداء سے اس سے الگ
رہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ میں بہت سے لوگ اس کو قومی تعلیم گاہ علی گڑھ
کا حریف سمجھتے رہے۔ موجودہ حالات نے ہر مسلمان میں یہ احساس پیدا کردیا ہے
کہ قوم کا جو کام ہو اب مجموعی قوت کے ساتھ ہونا چاہئے۔" (۱۳) شبلی

علامہ شبلی کا پیام طلبائے ندوہ کے نام: زمیندار لاہور کی ایک رپورٹ۔ افسوس ہماری آہ بے اثر اور نالہ نارسا ثابت ہوا، یعنی شمس العلما علامہ شبلی نعمانی نے باوجود ہماری التجا کے اپنا استعفا واپس نہ فرمایا اور ارکان انتظامیہ نے بھی بکثرت آرا مولانا کا استعفیٰ منظور کرلیا۔ اس اندوہناک واقعہ سے بے چین اور گوناگوں جذبات سے متاثر ہوکر طلبائے دارالعلوم و جمیع مدرسین نے ۲۷؍جولائی ۱۹۱۳ء کو بصدارت شمس العلما مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب پرنسپل دارالعلوم آخری مرتبہ اپنا قلق و اضطراب کا اظہار کرنے کے لیے ایک عام جلسہ کیا اور مولانا کی خدمت میں اظہار تاسف کا تار بھیجنے کی تحریک منظور کی۔ اس کے بعد مولانا موصوف کا وہ پیام سنایا گیا جو انہوں نے ساحل سمندر (بمبئی) سے متعلمین دارالعلوم کے نام بھیجا ہے اور جس کا ایک ایک لفظ مولانا کے دلی جذبات کا ترجمان ہے۔ واقعہ کی اہمیت اور اس پیام کی تاثیر ایسی زبردست تھی جس نے سامعین کے دلوں کو ہلادیا۔ اس موقعہ پر طلبہ نے اپنے پرجوش اور ولولہ انگیز تقریروں سے جلسہ کو مجلس ماتم بنادیا اور اس ناقابل تلافی نقصان پر نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ اظہار تاسف کیا۔ جلسہ کا آخری منظر نہایت پراثر تھا، جبکہ تمام حاضرین جلسہ نے نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہوکر مولانا کی صحت و درازی عمر کے لیے دعا مانگی اور آمین کی موثر آوازوں کے درمیان اس غم انگیز جلسہ کا خاتمہ ہوا۔

مولانا کا وہ پیام جو طلبائے دارالعلوم اور مدرسین کے نام آیا ہے، حسب ذیل ہے:

"مولانا اور جملہ مدرسین و طلبہ۔ تسلیم!

"آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن فرمایئے

چارہ کیا ہے؟ پورے چار برس گذرے، بجز اس کے کہ ہر کام میں میری مخالفت کی گئی اور کیا ہوا۔ اس بنا پر ندوہ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں ؟ اور ایک برس بھی آزادی سے کوشش کرتا تو ندوہ کو کچھ ترقی دے سکتا۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کر سکیں۔ ہر حال میں مدرسہ کا اور طلبہ کا ویسا ہی خدمت گذار رہوں گا۔ اب حمیت اور ہمدردی کا تعلق بے لاگ ہوگا، یعنی افسری کی ظاہری بیگانگی نہ رہے گی اور بچے دیکھیں گے............۔"(۱۴)

بقیہ حصہ پڑھا نہیں جا سکا۔

سید زادے کو دعائیں: تذکرہ قصیدہ نگاران امروہہ کے مصنف ڈاکٹر عظیم امروہوی نے لکھا ہے کہ ایک سید زادے سید سالم حسین نقوی متخلص بہ عرشی (۱۸۷۵-۱۹۶۰ء) نے نوجوانی میں "الفاروق" کا مطالعہ کیا اور علامہ شبلی سے ملاقات کے لیے چلے گئے اور بقول ڈاکٹر عظیم امروہوی:

"وہاں ایک گوشے میں نشست اختیار کی۔ اس موقع پر دیگر لوگ بھی موجود تھے، جب وہ چلے گئے تو شبلی آپ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ "صاحبزادے کہئے کیا کہنا ہے۔ آپ نے الفاروق پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ شبلی کی تحقیق و تلاش کی داد دی اور کہنے لگے کہ "بعد رسولؐ دروازہ حضرت علیؓ کو نذر آتش کرنے کا واقعہ جو آپ نے بیان کیا ہے، اس میں آپ نے یہ کمال کر دیا کہ ایک حقیقت کو قیاس سے بدل دیا ہے"۔ شبلی یہ جملہ سن کر عرشی کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور وطن وغیرہ معلوم کیا اور سید زادے کہہ کر دعائیں دیں۔"(۱۵)

شبلی مغفور کی ندا اقصائے غیب سے: یہ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳-۱۹۵۶ء) کی ایک نظم کا عنوان ہے جو انھوں نے علامہ شبلی کی ایک نظم کی زمین میں کہی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اور انہیں علامہ شبلی کی شاگردی پر ہمیشہ ناز رہا۔ یوں تو انھوں نے علامہ شبلی کا قصیدہ بھی لکھا ہے، لیکن ان کا یہ اعترافیہ شعر خاص طور پر قابل ذکر ہے:

یہ فیض صحبت علامہ شبلی کا صدقہ ہے کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی

مولانا ظفر علی خاں کی یہ نظم زمیندار لاہور ۱۶/ جون ۱۹۲۹ء کے شمارے میں سرورق پر شائع

ہوئی ہے اور آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

امان اللہ خاں بددل نہ ہو وہ دن بھی آتا ہے کہ پھر چل کر تری دولت ترے گھر سر کے بل آئے
ترا صبر آسماں سے کھینچ لائے حق کی رحمت کو اور اس رحمت کا چشمہ تیرے قدموں میں ابل آئے
پھریرا تیرا پھر لہرائے قندھار اور غزنی پر ترے قبضہ میں کابل آئے اور ساتھ اس کے ٹل آئے
بکھیرے اپنے جلوے پھر ترا اقبال مشرق میں یہ سورج حسب عادت پردۂ شب سے نکل آئے
مقدر کو گوارا ہو نہیں سکتا ترا جانا نظام ایشیا میں جس کے جاتے ہی خلل آئے
بھنور میں ناؤ تیری گھر گئی ہے یک بیک لیکن ''عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے''
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

شعر العجم کا عربی ترجمہ: شعر العجم کے فارسی زبان میں دو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی (۱۸۸۱۔۱۹۶۴ء) نے ایران میں اور سرور خاں گویا افغانستان کے ملک الشعرا نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ اب عربی اہل قلم اور علامہ شبلی نعمانی کی کئی کتابوں کے مترجم جناب جلال سعید الحفناوی نے شعر العجم کی ابتدائی تین جلدوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جسے المرکز القومی للترجمہ مصر نے شائع کیا ہے، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

نقد شعر العجم کا فارسی ترجمہ: انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''اردو'' میں علامہ شبلی کی کتاب شعر العجم پر حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰۔۱۹۴۶ء) نے تنقید لکھی، جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰۔۱۹۶۱ء) نے اولاً انجمن ترقی اردو کے مجلہ ''اردو'' میں بالاقساط شائع کیا۔ بعد ازاں ۱۹۴۲ء میں انجمن ہی کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیا، ایران میں اس کا فارسی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس کے مترجم ڈاکٹر شاہد چودھری اور ڈاکٹر توفیق سبحانی ہیں۔ دانش گاہ پیام نور ایران نے ۱۳۸۰ھ میں اسے شائع کیا ہے۔

شعر العجم کا سیریلیک ایڈیشن: سیریلیک ایک رسم الخط ہے جو تاجکستان اور اس کے قرب وجوار میں استعمال ہوتا ہے۔ شعر العجم کے فارسی ترجمہ از سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کا ایک ایڈیشن سیریلیک رسم الخط میں تاجکستان سے شائع ہوا ہے۔ سیریلیک رسم الخط میں کس نے منتقل کیا اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ سیریلیک ایڈیشن دو حصوں میں طبع ہوا ہے۔ پہلا حصہ ۵۴۴ صفحے اور دوسرا حصہ ۵۷۶ صفحے پر مشتمل ہے۔ مطبعہ دانش گاہ دولتی آموزگاری صدر الدین عینی تاجکستان سے شائع ہوا ہے۔ اسے مرکز

تحقیقات استرتژیک، تاجکستان سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سیرت طیبہ: علامہ شبلی نعمانی نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ایم اے او کالج کے طلبہ کے لیے سیرت پر عربی میں ایک رسالہ ”بدء الاسلام“ مرتب کیا تھا۔ جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل اور پڑھا پڑھایا جاتا رہا۔ علامہ حمید الدین فراہی (۱۸۶۴-۱۹۳۰ء) نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں (۱۸۹۴-۱۹۶۰ء) بھوپال کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو نے جو کئی کتابوں کی مصنفہ و مولفہ تھیں، بیگم سلطان جہاں (۱۸۵۸-۱۹۳۰ء) کی خواہش پر فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ”آغاز اسلام“ کے نام سے کیا۔ ان تینوں کا مجموعہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کی تحقیق و تدوین کے ساتھ دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے شبلی صدی مطبوعات کے تحت ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے۔ محقق نے بلاشبہ بڑی محنت اور دقت نظری سے کام لیا ہے۔ اس وجہ سے اب تک کی تمام اشاعتوں میں یہ سب سے معتبر اور صحیح اشاعت ہے۔

”آغاز اسلام“ کا ایک ایڈیشن یونیورسل بکس لاہور نے ۱۹۸۲ء میں ”سیرت طیبہ“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس کو محمد احسان الحق نے مرتب کیا اور بڑے مفید اور معلوماتی حواشی لکھے جس کی تفصیل خود ان ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

> ”موجودہ اشاعت میں میمونہ سلطان کے اردو ترجمہ کو متن کی ضروری تصحیح اور ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ متن میں آنے والی آیات کے نمبر اور متعلقہ صورتوں کے نام درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ترجموں میں جہاں کہیں الجھاؤ کا احساس ہوا ہے وہاں شاہ بانو کے ترجمہ آیت کی جگہ نامور علماء و مفسرین میں سے کسی ایک کا ترجمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ حواشی میں اس قسم کے اضافوں کے ساتھ ساتھ اصحاب و اشخاص و مقامات کتاب کے بارے میں ضروری تصریحات و توضیحات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ امید ہے کہ تہذیب و تحشیہ کے اس کام سے کتاب زیادہ مفید اور معلومات افزا ہو جائے گی۔“ (۱۶)

”سیرت طیبہ“ پر نامور اہل قلم اور مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے تفصیلی، عمدہ، جامع اور معلومات افزا مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔

سیرۃ النبیؐ میں ذکر اہل بیت: حال ہی میں ایران میں لکھے جانے والے ایک مقالے کی خبر

ملی ہے، اس مقالے کا عنوان ''سیرۃ النبیؐ میں نبی کریمؐ اور اہل بیت کے بارے شبلی نعمانی کے نقطہ نظر کا تجزیہ'' ہے۔ یہ مقالہ حسن رضا حیدری نے ڈاکٹر رجب نزاد کی رہنمائی میں لکھا ہے اور پی ایچ ڈی کے لیے جامعہ المصطفیٰ میں ۸۹-۱۳۸۸ھ میں جمع کیا ہے۔ یہ تھیسس تہران کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

علامہ شبلی کی ایک نظم کا انگریزی ترجمہ: ایڈیٹر زمیندار لاہور مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳-۱۹۵۶ء) علامہ شبلی نعمانی کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ انہیں انگریزی زبان وادب پر بڑا عبور حاصل تھا، ترجمہ کی بھی ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ چنانچہ انہوں نے متعدد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ''معرکہ مذہب و سائنس'' ان کا ایک معرکہ آرا ترجمہ ہے۔ انہوں نے اپنے استاذ کی شہرہ آفاق کتاب ''الفاروق'' کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، جس کے ایک سے زاید ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے استاذ کی سانحہ مسجد کانپور والی مشہور نظم کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس نظم کا عنوان ہے:

''ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں''

چونکہ یہ علامہ شبلی کی اردو شاعری کا انگریزی میں پہلا اور غالباً تنہا نمونہ ہے۔ اس لیے اسے اصل نظم کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

کل مجھ کو چند لاشہ بے جاں نظر پڑے　　دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر　　نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشہ شباب　　ظاہر میں گرچہ صاحب عقل وشعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ　　مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار　　از بسکہ مست بادہ ناز وغرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے جو سر　　لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا　　جو خاک وخون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا　　ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں

انگریزی ترجمہ:

I saw some lifeless bodies yesterday,
All pierced through with gaping wounds were they.

And some were children silent as the tomb,
Their tender years reproached their tragic doom.
"We came to build the House of God on high,
But feeling drowsy slept, they seemed to sigh"
"And now we wait till Israfil shall sound,
His clarion which will bring senses round"
And some were young, even in the prime of life,
Versed in world`s ways, skilled in stress and strife.
Their singing youth in tones of burning pride,
Confessed the guilt which weakness strove to chide.
Their haughty valour made their brawny breast,
A living shield for lance set in rest.
Their eager souls forestalled their ghostly fate,
Their right hands cut their throats, they scorned to wait.
And some were old men here not with rage and toil,
Who moved to shuffle off this mortal coil.
And as they rolled in dust and blood it seemed,
A halo round their beaming bodies gleamed.
I said "who are you" and could say no more,
A voice replied, "The victims of Cawnpore". (17)

انجمن ترقی اردو: ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صدر اور علامہ شبلی اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ علامہ نے انجمن کو باقاعدہ ادارہ بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ راقم کی کتاب ''نوادرات شبلی'' کی ۲۰۱۷ء میں اشاعت کے بعد انجمن ترقی اردو سے متعلق علامہ شبلی کی درج ذیل نادر تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ افادیت کے پیش نظر اسے قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

''انجمن ترقی اردو نے اردو کی ترقی دینے کے لیے جو تدبیریں اختیار کی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ جن مضامین پر نئی تصنیفات کی ضرورت ہے وقتاً فوقتاً ان کو اخبارات کے ذریعہ سے مشتہر کرے گی۔ اس کے ساتھ مصنّفین کو مواد تصنیف اور

طریقہ تصنیف کے متعلق ہر قسم کی ہدایت کرے گی اور اعانت دے گی۔ مجلس انتظامی نے بالفعل جن مضامین کو منتخب کیا ہے حسب ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ التاریخ۔ یعنی فن تاریخ (خاص مسلمانوں کی تاریخ مقصود ہے۔) کب اور کن اسباب سے پیدا ہوا!، کیونکر درجہ بدرجہ بڑھا!، کتنے دور قائم ہوئے!، ہر دور کی کیا خصوصیات ہیں؟، ملکی اور مذہبی حالت نے اس فن پر کیا کیا اثر پیدا کیے؟ مشاہیر مورخین کے نام، ان کی مختصر سوانح عمریاں، ان کی خصوصیات، کتب تاریخ کی فہرست، آج جو کتابیں دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں ان کی فہرست وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ ہندو عہدہ داران سلطنت تیموریہ۔ اس کتاب میں ان تمام ہندو عہدہ داران کے حالات ہوں گے جو سلطنت تیموریہ میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ممتاز تھے اور جن کا اعزاز درجہ اور حقوق تمام بڑے بڑے مسلمان ارکان سلطنت کے برابر تھے۔

۳۔ قاموس النساء۔ جس میں ان مراتب کی تفصیل ہوگی۔ اسلام سے پہلے عورتوں کی کیا حالت تھی اور اسلام نے کیا اصلاحیں کیں؟، اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق عطا کیے، مختلف زمانوں میں عورتوں کے تمدن، تعلیم، آزادی، معاشرت، وضع، لباس وغیرہ کی جو حالت تھی اس کی تفصیل، ان میں سے ہر تصنیف پر معتدبہ اور کافی صلہ دیا جائے گا جس کی مقدار آئندہ متعین کی جائے گی۔

جو حضرات ان مضامین پر لکھنا چاہیں سکریٹری سے خط کتابت فرمائیں۔

شبلی نعمانی

سکریٹری انجمن اردو حیدرآباد(۱۸)''

الامام ابن تیمیہ الحرانی، مجدداً لقرنہ: علامہ شبلی نعمانی کے متعدد مقالات کتابچوں کی صورت میں مختلف مکتبات سے شائع ہوئے ہیں۔ علامہ کے اس طرح کے کئی کتابچوں کا ذکر راقم نے ''کتابیات شبلی''، میں مدونہ کتب و رسائل کے ذیل میں کیا ہے۔ حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ علامہ شبلی کے مشہور مقالہ ''امام ابن تیمیہ حرانی'' (ماہنامہ الندوہ جلد ۵ شمارہ ۶) کو دارالعلم بمبئی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس میں افادیت کے پیش نظر امام ابن تیمیہؒ پر مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) کے

مضمون کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ اردو میں اپنے موضوع پر پہلا مقالہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کو اردو داں حلقہ میں سب سے اول علامہ شبلی نے متعارف کرایا۔ ۶۰ رصفحات پر مشتمل اس ترجمہ کا سنہ اشاعت ۲۰۱۶ء ہے۔ اس کے مرتب محمد تنزیل الصدیقی الحسینی ہیں۔ لائق مرتب نے تقدیم کے ساتھ جا بجا مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق اس قیمتی مقالہ کو ڈاکٹر محمد اکرم ندوی استاذ آکسفورڈ یونیورسٹی نے عربی میں منتقل کر دیا ہے، جسے دار البشائر الاسلامیہ نے شائع کیا ہے۔

تعلیقات وحواشی

(۱) ایک مشرقی کتب خانہ، مترجمہ سید مبارز الدین رفعت، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ص ۸۔۹۔ (۲) مجالس حکیم الامت ازمولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ماہنامہ البلاغ، کراچی، مارچ ۱۹۷۰ء ص ۳۹۔ ۴۰، ومجالس حکیم الامت ص ۶۷، تحریر و ترتیب مولانا مفتی محمد شفیع، دارالاشاعت کراچی ۱۳۹۶ھ، طبع دوم۔ (۳) حیات شبلی ص ۶۵۹، مکتبہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۵ء۔ (۴) ہفت روزہ چٹان لاہور، ۲۹ راگست ۱۹۸۳ء، ص ۳۹۔ (۵) ماہنامہ الحمراء، لاہور، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۔ (۶) ڈاکٹر امرت لعل عشرت، سخنوران بنارس ص ۳۱، اکرام حسین لیتھو الکٹرک مشین پریس پر ہلاد گھاٹ وارانسی، ۱۹۶۸ء۔ (۷) ماہنامہ الحمراء، لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء ص ۲۰۔ (۸) ایضاً ص ۲۱۔ (۹) روزنامچہ سیاحت، ص ۱۶۳۔ (۱۰) ایم اے او کالج میں علامہ شبلی کے لائبریرین ہونے کا ذکر اس کے علاوہ اور کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ چونکہ سرسید نے اپنی ذاتی لائبریری شبلی کے سپرد کر دی تھی اس لیے ممکن ہے علامہ شبلی نے خود سے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو۔ (۱۱) مرد درویش (خواجہ غلام الثقلین) خواجہ غلام الحسنین، ص ۱۱، سرفراز پریس لکھنو۔ (۱۲) زمیندار، لاہور، یکم دسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۳۔ (۱۳) زمیندار، لاہور، ۱۵ ردسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۳۔ (۱۴) یہ رپورٹ اور علامہ شبلی نعمانی کا مراسلہ دونوں زمیندار لاہور میں شائع ہوئے ہیں۔ جناب احمد سعید صاحب نے اس کا عکس بھیجا تھا مگر وہ ناصاف تھا، تاریخ بھی نہیں پڑھی جا سکی۔ مراسلہ بھی نامکمل ہے، قیاس ہے کہ یہ مراسلہ اگست ۱۹۱۳ء سے لے کر جنوری ۱۹۱۴ء کے درمیان شائع ہوا ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود زمیندار کا وہ شمارہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ (۱۵) میمونہ سلطان شاہ بانو، سیرت طیبہ ص ۱۰، یونیورسل بکس لاہور ۱۹۸۲ء۔ (۱۶) ڈاکٹر عظیم الدین امروہوی، قصیدہ نگارانِ امروہہ، ص ۲۱۴، مرثیہ سینٹر دہلی، ۲۰۱۶ء۔ (۱۷) مرغزار، ظفر علی خاں نمبر، شیخوپورہ گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۱ء، ص ۲۸۸، بحوالہ بازیافت (۲۷) شعبہ اردو اورینٹل کالج لاہور ص ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ (۱۸) روزنامہ زمیندار، لاہور ۸ مارچ ۱۹۰۴ء۔

کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کے جواب آتے ہیں

خطوط جگن ناتھ آزاد

جناب وارث ریاضی

راقم الحروف جن دنوں مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی مغربی چمپارن بہار میں زیر تعلیم تھا اس وقت حضرت مولانا سید نظام الدین (۱۹۲۷-۲۰۱۵ء) سابق امیر شریعت بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ مدرسہ ریاض العلوم میں صدرالمدرسین کے عہدے پر فائز تھے، مولانا موصوف کا علمی وادبی ذوق بہت عمدہ تھا، شعروادب سے راقم الحروف کی دلچسپی دیکھ کر انہوں نے ناچیز کو مدرسے کی ابوالکلام لائبریری کا انچارج بنادیا تھا، اس وقت لائبریری میں ہندوستانی رسالوں میں بہ طور خاص ''بیسویں صدی'' اور پاکستان سے ماہنامہ ''فاران'' پابندی سے آتے تھے، ناچیز اپنی طرف سے ماہنامہ ''شاعر'' اور ''آج کل'' منگواتا تھا۔

فاران میں ماہرالقادری مرحوم (۱۹۰۶-۱۹۷۸ء) کے اداریے ''نقش اول'' کے علاوہ ان کی غزلیں اور مقالات گاہے گاہے فاران، بیسویں صدی اور آج کل میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد (۱۹۱۸-۲۰۰۴ء) کی غزلیں اور فاران میں آزاد صاحب کے فکرانگیز مضامین پڑھ کر دل کو سرورِ آگہی نصیب ہوتا، اس طرح ان دونوں شخصیات کی علمی وادبی عظمت ''لوح دل'' پر نقش ہوگئی۔

ریاض العلوم ساٹھی کی تعلیم سے فارغ ہوکر ۱۹۶۱ء میں ناچیز نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا، اسلامی علوم کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کا ادبی وشعری ماحول بھی قابل تحسین تھا، علامہ انور صابری (۱۹۰۱-۱۹۸۵ء) اور مولانا عامر عثمانی مرحوم (۱۹۲۰-۱۹۷۵ء) کی ادبی اور شعری عظمت کی شہرت پورے برصغیر میں اوج کمال پر تھی، ناچیز کی علمی نشوونما دیوبند کے علمی وادبی ماحول میں ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند سے ماہنامہ ''دارالعلوم دیوبند'' نکلتا تھا (اور آج بھی نکل رہا ہے) ناچیز کے طالب علمی کے زمانے میں ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر مولانا ازہر شاہ قیصر (۱۹۱۹-۱۹۸۵ء) تھے لیکن

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریہ، مغربی چمپارن (بہار) موبائل: ۲۸۲۸۹۰۲۵۴۸۔

عموماً بلکہ اکثر وبیشتر مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی (۱۹۲۶-۲۰۱۱ء) اداریہ لکھتے تھے، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت الم مظفرنگری مرحوم (وفات ۱۹۴۹ء) کی غزلیں اکثر شائع ہوتی تھیں، جن کو پڑھ کر ناچیز بہت محظوظ ہوتا، استاد محترم حضرت مولانا سید شاہ انظر کشمیریؒ (۱۹۲۷-۲۰۰۸ء) سے الم مظفرنگری کی فکر انگیز غزلوں کی تعریف وتحسین سن کر الم مظفرنگری سے بھی عقیدت ہوگئی۔

۱۹۶۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۹۶۶ء میں ریاض العلوم ساٹھی میں ناچیز کا مدرس کی جگہ پر تقرر ہوگیا، اسی دوران ناچیز مولانا انظر شاہ کشمیری کی سفارش پر حضرت الم مظفرنگری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگیا، ۱۹۶۹ء میں الم مظفرنگری کا انتقال ہوگیا تو ناچیز نے ماہرالقادری مرحوم سے رجوع کیا اور ان سے اصلاح لیتا رہا، ایک بار انھوں نے اپنی علمی وادبی مشغولیات کے پیش نظر اصلاح دینے سے معذرت کا اشارہ کردیا۔

غالباً فروری ۱۹۷۵ء کے آخری عشرے میں راقم الحروف نے ماہرالقادری صاحب کو خط لکھا کہ آپ پروفیسر جگن ناتھ آزاد (۱۹۱۸-۲۰۰۴ء)، عرش ملیسانی (۱۹۰۸-۱۹۷۹ء)، نشور واحدی (۱۹۱۲-۱۹۸۳ء) اور میکش اکبرآبادی (۱۹۰۲-۱۹۹۱ء) میں سے کسی ایک صاحب سے سفارش کردیں کہ میں ان سے مشورت سخن لے سکوں، خط کے ساتھ راقم الحروف نے ایک نعت بھی ماہر صاحب کو نظر ثانی کے لیے ارسال کردی۔

ماہر صاحب نے نظر ثانی کے بعد نعت واپس کردی اور ناظم آباد کراچی سے ۱۰/مارچ ۱۹۷۵ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا:

جناب مکرم! السلام علیکم۔ مدت کے بعد آپ کا کرم نامہ ملا، یادآوری کا شکریہ، ہاں! عرش ملسیانی، میکش اکبرآبادی اور جگن ناتھ آزاد، ان میں سے کسی ایک صاحب کو میرے حوالہ سے لکھیے، وہ آپ کو مشورہ دینے سے غالباً گریز نہیں کریں گے، میرے خیال میں اب آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، کلام میں خاصی روانی آ گئی ہے، جو تھوڑی بہت کور کسر رہ گئی ہے وہ مشق ومطالعہ سے دور ہوجائے گی۔

آپ کا کلام بعد مشورت واصلاح واپس ہے۔

فاران کا چندہ سات روپے سالانہ ہے اور ہندوستان بھیجنے میں ایک شمارہ پر اسی[۸] پیسے کا محصول ڈاک لگتا ہے، اس کا چندہ موصول ہونے کی کوئی صورت اور ذریعہ نہیں ہے، تازہ ترین فاران بھیج رہا

ہوں، آپ کی صحت یابی کے لیے دعا کرتا ہوں، گردوں کی تکلیف کا علاج بالمثل یہ ہے کہ آپ بکری کے گردے بہ کثرت تناول فرمایا کریں، کسی طبیب سے بھی احتیاطاً دریافت فرمالیں، والامر بیدہ۔

میں بحمداللہ خیریت سے ہوں۔ خیراندیش

ماہرالقادری

راقم الحروف نے اپنے خط بنام ماہرالقادری میں مذکورہ شعرا کے ساتھ نشور واحدی صاحب کا نام بھی لکھا تھا لیکن ماہر صاحب سے غالباً نشور صاحب کا نام سہواً رہ گیا۔

اس کے بعد راقم الحروف شدید علالت کے باعث مارچ ۱۹۷۵ء سے ماہرالقادری مرحوم سے رابطہ قائم نہیں کرسکا، البتہ ایک بار نشور واحدی صاحب کو ایک غزل اصلاح کے لیے بھیجی جس کا حسن مطلع تھا:

چمن والو! فریب باغباں سے اٹھے فتنے ہزاروں گلستاں سے

اس کے پہلے مصرعے کو نشور واحدی صاحب نے یوں کردیا:

فریبِ باغبانانِ چمن دیکھ

اور جس کاغذ پر غزل لکھی گئی تھی اس کے حاشیے پر نشور واحدی صاحب نے یہ تحریر فرمایا:

"ماشاءاللہ آپ خوب کہتے ہیں، سلیقہ خداداد شے ہے"۔

پھر انہوں نے غزل واپس کردی، اس کے بعد راقم الحروف نے کسی استاد شاعر سے رجوع نہیں کیا۔

۱۹۷۸ء میں جدہ کے ایک مشاعرے میں ماہرالقادری کا انتقال ہوا، ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی (۱۹۲۵-۲۰۰۶ء) کے مضمون "ماہرالقادری کی آخری سانس" (۱) کے حوالے سے ماہرالقادری کی وفات کے واقعے کا ذکر کرنا شاید یہاں بے محل نہیں ہے کہ جدہ میں مقیم پاکستانی باشندوں کے تعاون سے پاکستانی سفارت خانے کی سرپرستی میں ۱۱ر مئی ۱۹۷۸ء کی رات میں جدہ میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس میں پاکستان کے نامور شعرا میں ماہرالقادری (۱۹۰۶-۱۹۷۸ء)، حفیظ جالندھری (۱۹۰۰-۱۹۸۲ء) اور احسان دانش (۱۹۱۱-۱۹۸۲ء) وغیرہم شعرا نے شرکت فرمائی، مشاعرے کے دوسرے دور میں ماہرالقادری کے بعد احسان دانش نے اپنا کلام سناتے ہوئے جب یہ شعر:

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں انہیں مت بھولو جانے کب کون سی تصویر لگادی جائے

پڑھا تو اسے سن کر ماہرالقادری آب دیدہ ہو گئے، احسان دانش کے بعد حفیظ جالندھری نے اپنا کلام سنانا شروع کیا اور ماہرالقادری صاحب کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ شدید یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہم سائے

یہ شعر سن کر ماہرالقادری صاحب کھڑے ہوئے اور اپنی طرف مائک سیدھا کرتے ہوئے بولے: ''حفیظ صاحب غلط جگہ پر آ گئے''، مطلب یہ تھا کہ بہشت میں مولوی تو اپنی جگہ پر آیا، حفیظ صاحب غلط مقام پر آ گئے کہ ان کو یہ ''عذاب شدید'' معلوم ہو رہا ہے۔

ماہرالقادری صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حفیظ جالندھری نے دوبارہ درج بالا شعر پڑھا، اس کے فوراً بعد ماہر صاحب پر دل کا شدید دورہ پڑا اور آناً فاناً ان کی روح جسم عنصری سے پرواز کر گئی، ۱۲ر مئی کی رات میں مکہ مکرمہ کے مشہور قبرستان جنت المعلیٰ میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی (۱۸۱۸-۱۸۹۹ء) کی قبر کے پاس ان کی تدفین عمل میں آئی،(۲) اس طرح ماہر صاحب کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی:

وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت مسلسل ہے پیش نظر اللہ اللہ

''جنت معلیٰ'' مسجد حرام سے جانب مشرق جانب میں واقع ہے جہاں سے مسجد حرام جانب مغرب میں صاف نظر آتی ہے۔

بہرحال اخباروں کے ذریعے جب ماہرالقادری مرحوم کی وفات کی خبر ملی تو راقم الحروف نے ان کی وفات سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی اور فروری ۱۹۷۹ء کے پہلے ہفتے میں پہلی بار اس کو پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجی۔ اس نظم کا تیسرا شعر تھا:

عمر بھر تو نے دیا امت کو درسِ زندگی قوم میں پیدا کیا تو نے مذاقِ زندگی

پانچواں شعر تھا:

تیرے سینے میں نہاں صدق وصفا کا نور تھا بادۂ حبّ نبیؐ سے دل ترا مخمور تھا

نواں شعر اس طرح تھا:

جرأتِ اظہارِ حق سے پاک میں اے ہوشمند تو نے اسلامی صحافت کا کیا پرچم بلند

دسواں شعر:

تیری تحریروں نے پیدا کر دیا وہ انقلاب منہدم ہے قصر باطل خانۂ بدعت خراب

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں قصر باطل کے منہدم ہونے اور خانۂ بدعت کے خراب ہونے سے ناچیز کی مراد ماہر القادری مرحوم کی وہ تحریریں ہیں جو مخالفین اسلام اور شرک و بدعت کے رد میں لکھی گئی ہیں۔ گیارہویں شعر کے پہلے مصرعے میں کوئی لفظ چھوٹ گیا تھا۔ بارہواں شعر مکرر درج ہوگیا تھا۔ اٹھارہویں شعر کے پہلے مصرعے میں بھی کوئی لفظ غائب تھا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ناچیز کی نظم اور ماہر القادری مرحوم سے اپنے دیرینہ تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے جموں سے ناچیز کے نام اپنے پہلے خط میں تحریر فرمایا:

(۱)

جموں

۲۱/۲/۷۹ء

محبی! تسلیم۔ خط ملا، شکریہ۔ جواب میں تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی نظم اچھی ہے، مجھے صرف چند باتیں اس سلسلے میں کہنا ہیں:

۱۔ زندگی اور بندگی کا قافیہ میں صحیح نہیں سمجھتا، زندگی کا قافیہ میرے نزدیک رخشندگی، تابندگی ہونا چاہیے نہ کہ بندگی، (اس میں ب بالفتح ہے)، (تیسرا شعر)۔

۲۔ آپ نے مخمور کا لفظ سرشار یا مست شراب کے معنی میں استعمال کیا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، خمار نشے کے اتار کی کیفیت کو کہتے ہیں، محبوب کی آنکھوں کی کیفیت کو خمار آلود کہہ سکتے ہیں یا مخمور، دل کو نہیں۔ (پانچواں شعر)

۳۔ نویں شعر کے مصرع اول میں پاکستان کا لفظ بہ آسانی آسکتا ہے، ذرا محنت سے کام لیجیے، پاکستان کی جگہ ''پاک'' لکھ کے اسے واوین میں محصور کرنا کہ انتقال ذہنی پاکستان کی طرف ہو، تکلف ہے، آپ مصرع دوبارہ کہیے اور اس میں لفظ پاکستان لائیے۔

۴۔ دسویں شعر میں قصر باطل، خانۂ بدعت خراب نہیں سمجھا۔ ۵۔ گیارہویں شعر کے مصرع اول میں کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ ۶۔ بارہواں شعر آپ نے دوبارہ لکھا، ایسی بھی کیا بے احتیاطی؟ ۷۔ اٹھارہویں شعر کے پہلے مصرع میں کوئی لفظ غائب ہے۔ (۳)

ماہر القادری مرحوم میرے عزیز اور محترم دوست تھے، دسمبر ۷۷ء میں ان سے میری آخری

ملاقات ہوئی، لاہور میں جب اقبال عالمی کا کانگریس میں شرکت کے لیے گیا، وہ مجھ سے ملنے میرے ہوسٹل تشریف لائے، میں موجود نہ تھا لیکن میری روانگی سے ایک رات قبل ایک نشست میں ملاقات ہوگئی اور یہ ان سے میری آخری ملاقات تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ نیازمند

جگن ناتھ آزاد

فروری ۱۹۸۰ء میں کے آغاز میں ناچیز نے اپنی ایک نعت اور ایک غزل اصلاح کے لیے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو ارسال کیں تو انھوں نے جموں یونیورسٹی سے ۲۸/ ۲/ ۱۹۸۰ء کو ناچیز کے نام یہ خط لکھا:

(۲)

۲۸/ ۲/ ۱۹۸۰ء

محب گرامی قدر! تسلیم۔ عنایت نامہ ملا اور نعت شریف اور غزل بھی۔ دونوں تخلیقات عمدہ ہیں، اصلاح کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ مطالعہ اور مشق سخن جاری رکھیے۔

آپ اجازت دیں تو یہ دونوں تخلیقات ''ادبیات'' میں شریک اشاعت کرلی جائیں، ادبیات کا پہلا شمارہ عنقریب آپ کو بھجوادیا جائے گا، مارچ میں منظر عام پر آرہا ہے، آپ کی تخلیقات اپریل یا مئی کے شمارے میں آجائیں گی۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ نیازمند

جگن ناتھ آزاد

جموں و کشمیر پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن نے اپنا ترجمان اردو میں ماہنامہ ادبیات کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ادبیات کی مجلس ادارت حسب ذیل ارباب فکر و نظر: ۱۔ وید پال ۲۔ ڈاکٹر خورشید حمرا ۳۔ طالب ایمن آبادی ۴۔ کلدیپ گوہر پر مشتمل تھی، جموں کے مشہور دانشور کشمیر ٹائمز کے مدیر جناب وید بھسین صاحب ادبیات کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد ''ادبیات'' کے مدیر اعزازی۔

ادبیات کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۲۸/ ۲/ ۸۰ء کے خط میں ناچیز کی نعت اور غزل کو ادبیات کے اپریل یا مئی کے شمارے میں شائع کرنے کے لیے اجازت طلب کی تھی، ناچیز نے اشاعت کی اجازت دے دی، ادبیات کا سالانہ چندہ بھی بھجوادیا اور اپنے خط کے ساتھ ایک نئی غزل بھی آزاد صاحب کو ارسال کردی، آزاد صاحب نے منی آرڈر، خط اور

غزل کی وصول یابی کی اطلاع دیتے ہوئے ۱۵؍مئی ۱۹۸۰ء کو جموں یونیورسٹی سے یہ خط لکھا:

(۳)

۱۵؍مئی ۸۰ء

محبی! تسلیم۔عنایت نامہ ملا، ممنون ہوں، ۲۰ روپے کا منی آرڈر اس سے قبل مل چکا ہے، کل ادبیات کے اسسٹنٹ منیجر دیپ جی آئے تھے، انہیں یہ روپئے دے دیے گئے ہیں، امید کہ مارچ کا شمارہ اس وقت تک مل چکا ہوگا، اپریل اور مئی کے شمارے پریس میں ہیں۔

آپ کی نئی غزل دیکھی، اچھی ہے، اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، جون کے شمارے میں آرہی ہے، یہاں کتابت اور طباعت کی بہت مشکلات ہیں، چند ماہ بعد رفع ہوسکیں گی۔

منیجر کا پتہ یہ ہے: Shri Ved Bhasin

Managing Editor Adabiyat

Shahidi Chowk, Jammu Tavi(۴)

ادبیات کا چندہ تیس روپے ہے، دس روپے انہیں اور بھجوادیجیے گا، ان بیس روپوں کا حوالہ دے کر۔خدا کرے آپ جلد صحت یاب ہوجائیں۔

نیازمند

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد کے درج بالا خط موصول ہونے کے بعد پہلے ادبیات مارچ ۸۰ء کا شمارہ ملا اور اس کے بعد اپریل کا ادبیات باصرہ نواز ہوا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے حسب وعدہ اس شمارے میں اس ناچیز کے خط کے ساتھ نعت شائع کی۔(۵)

نعت کی اشاعت پر شکریہ ادا کرتے ہوئے راقم الحروف نے آزاد صاحب کو لکھا کہ غیر مسلم ہوتے ہوئے آپ نے میری نعت شائع کی، جب کہ عبدالسلام مچھلی شہری (۱۹۲۱۔۱۹۷۳ء) نے ایک بار ماہنامہ شاعر کے مدیر شہیر اعجاز صدیقی مرحوم (۱۹۱۳۔۱۹۷۸ء) کو شاعر کے لیے ایک نعت بھیجی تو اعجاز صدیقی نے عبدالسلام مچھلی شہری کو لکھا:

''شاعر ادبی پرچہ ہے، ایک نعت شائع کردینے سے دوسرے شعرا کے نعتیہ کلام کی اشاعت کا جواز پیدا ہوجائے گا''۔(۶)

ادبیات کے درج بالا اپریل کے شمارے میں ''گوشہ اقبال'' کے تحت جناب صادق نسیم

صاحب کا مضمون ''اقبال منفرد نعت گو'' شائع ہوا تھا، جس میں فاضل مضمون نگار نے علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) کے مندرجہ ذیل اشعار:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

بہ مصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کے حوالے سے مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۸۷-۱۹۵۷ء) کے نظریہ وطن پر اعتراض کیا تھا، جگن ناتھ آزاد کے نام اپنے خط میں راقم الحروف نے دلائل کے ساتھ تفصیل سے صادق نسیم صاحب کے اعتراض کا جواب دیا تھا، خط کے ساتھ راقم نے ایک غزل بھی ارسال کی تھی، شہیدی چوک جموں سے آزاد صاحب نے خط کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا:

(۵)

Shahidi Chowk
Jammu Tavi-180001

۲۷/جولائی ۸۰ء

محب گرامی قدر! وعلیکم السلام۔ عنایت نامہ ملا، سراپا سپاس ہوں۔ نعت کے متعلق میں سید احتشام حسین اور اعجاز صدیقی کا ہم خیال نہیں ہوں، نعت کو ہم محض اس لیے نظر انداز کریں کہ یہ نعت ہے ایک غیر صحت مند نظریہ ہے، اصل معیار اس کا شعری اور ادبی مرتبہ ہے، اردو اور فارسی میں ہمیں نعت کے ذریعے سے بلند پائے کے ادب پارے ملے ہیں، انہیں کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

آپ نے اچھا کیا کہ صادق نسیم صاحب کے مقالے پر تفصیل سے اپنے خیال کا اظہار کیا، میں خود اس مقالے کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا، اب میری تحریر کی ضرورت نہیں رہی، آپ کا خط مکمل صورت میں شریک اشاعت کیا جا رہا ہے، آپ نے بہت مدلل طریقے سے بات کی ہے۔

غزل اچھی ہے، بلا سبب میں اصلاح کا قائل نہیں، اسی صورت میں چھپ رہی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ پہلے دو شماروں کی طباعت اچھی نہیں ہوئی، اب ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ طباعت بہتر ہو، اگر جموں میں اچھی طباعت ممکن نہ ہوئی تو دہلی میں چھپوائیں گے۔

لیکن اس سے زیادہ جو مسئلہ مجھے پریشان کر رہا ہے وہ اشتہاروں اور خریداروں کا ہے، اس

پر سارا خرچ وید بھسین صاحب اپنی جیب سے کرر ہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ انہیں کچھ حاصل ہو نہ ہو، ان کا خرچ پورا ہو جائے، اشتہاروں کے لیے تو ہم لوگ کوشش کرر ہے ہیں، خریداروں کے معاملے میں ہماری مدد کیجیے جہاں تک ممکن ہو سکے، کسی لائبریری یا کسی فرد کی طرف سے چندہ بھجوایئے براہ راست وید بھسین صاحب کے پتے پر۔ پتہ یہ ہے:

''وید بھسین، جنرل منیجر، ماہنامہ ''ادبیات''، شہیدی چوک، جموں توی''

اقبالیات اور اسلامیات پر آپ کی گہری نگاہ ہے، ان سے متعلق کسی موضوع پر مقالہ بھیجیے، آپ کے حلقہ احباب میں اسلام کے ادبی پہلو پر کوئی لکھنے والا ہو تو اس طرح کے مقالے کی اشاعت میرے لیے باعث مسرت ہوگی، امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ نیازمند

جگن ناتھ آزاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے پانچویں مکتوب درج کرنے سے پہلے ان کی مشہور کتاب ''اقبال اور کشمیر'' کے حوالے سے دو باتیں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر آزاد صاحب کے پانچویں مکتوب میں آیا ہے:

۱۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنی تصنیف ''اقبال اور کشمیر'' میں مولوی احمد دین لاہوری (۱۸۶۵-۱۹۲۹ء) کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، احمد دین کی مشہور و معروف کتاب ''سرگذشت الفاظ'' کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

''ان کی کتاب ''سرگذشت الفاظ'' اردو کے ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہے...... لیکن مجھے یہ کتاب دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا، ہاں! ان کی کتاب ''اقبال'' کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال شناسوں میں ان کا رتبہ بہت اونچا ہے''۔(۸)

۲۔ بارہمولا علاقہ کشمیر کے رئیس خواجہ عبدالصمد ککڑو سے علامہ اقبال کے گہرے مراسم تھے، خواجہ صاحب کے ایک بیٹے کی مرگ ناگہاں پر اقبال نے نوحہ لکھا، نوحہ کے اشعار درج کرنے کے بعد جگن ناتھ آزاد رقم طراز ہیں:

''غالباً یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نوحہ درد و گداز سے یکسر خالی ہے اور سبب اس کا ظاہر ہے، اس ضمن میں مجھے شعر العجم میں شبلی نعمانی مرحوم کا بیان کیا ہوا واقعہ یاد آرہا ہے، غالباً ہارون الرشید کا ذکر ہے، ان کے ایک درباری شاعر کے بھائی کا انتقال

ہو گیا، شاعر نے نوحہ لکھا اور ایسا کہ ہر پڑھنے والے کا دل تڑپ اٹھتا تھا اور بے اختیار
اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے، کچھ مدت کے بعد خلیفہ کے ایک عزیز کا
انتقال ہوا، خلیفہ نے شاعر سے فرمائش کی ویسا ہی مرثیہ میرے عزیز کے انتقال پر لکھو،
شاعر نے مرثیہ لکھا، خلیفہ نے پڑھا اور اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا، مرثیہ درد و گداز
سے قطعاً خالی تھا، خلیفہ نے سبب پوچھا، شاعر نے کہا: جہاں پناہ وہ مرثیہ میرے بھائی
کا تھا اور یہ ایک ایسے شخص کا ہے جس سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا''۔(۹)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے شعر العجم کے حوالے سے ہارون الرشید (۷۱۲-۸۰۹ء) کے درباری شاعر کے مرثیے کا درد و گداز سے یکسر خالی ہونے کے ضمن میں جو واقعہ بیان کیا ہے وہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (شہادت ۶۴۴ء) کے عہد خلافت کے شاعر متمم کے مرثیے سے تعلق رکھتا ہے اور وہ واقعہ شعر العجم میں نہیں بلکہ اسے موازنہ انیس و دبیر میں علامہ شبلی (۱۸۵۹-۱۹۱۴ء) نے بیان کیا ہے۔

عرب کے اس درد آشنا شاعر متمم کے مرثیے کے درد و گداز کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

''ایک لڑائی میں خالد بن ولید نے اس کے بھائی کو مار ڈالا، اس پر متمم کی یہ
حالت ہوگئی کہ گھر بار چھوڑ کر نکلا اور قبائل عرب میں پھرنا شروع کیا، جہاں پہنچتا تھا
تمام مرد و زن اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، وہ درد انگیز لہجے میں مرثیہ پڑھتا اور
ہر طرف سے گریہ وزاری کی آواز بلند ہوتی، اس کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے سمجھایا
کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارے خاندان کی کوئی یادگار باقی نہ رہے گی، اس لیے تم
شادی کر لو کہ اولاد کے ذریعہ خاندان کا نام رہ جائے، لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر
اس نے شادی کر لی لیکن بیوی کی طرف التفات نہ کر سکا، آخر طلاق دینی پڑی۔

اسی حالت میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا، وہ اس وقت مسجد نبویؐ میں تشریف
رکھتے تھے، متمم نے مرثیے کے اشعار پڑھنا شروع کیے، حضرت عمرؓ اگر چہ مضبوط دل
کے آدمی تھے لیکن ضبط نہ کر سکے، بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، متمم مرثیہ
پڑھ چکا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''الی ما بلغك الحال'' یعنی تیرے غم کی حالت

کس حد تک پہنچی ہے؟ اس نے کہا: امیر المومنین! مجھ کو ایک عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میری بائیں آنکھ کی رطوبت جاتی رہی، میں روتا تھا تو آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے تھے، بھائی کے مرنے کے بعد جو آنکھ سے آنسو جاری ہوئے تو اب تک نہیں تھمے۔

حضرت عمرؓ نے اس سے فرمائش کی کہ ان کے بھائی زیدؓ کا مرثیہ لکھے، اس نے فرمائش پوری کی لیکن جب دوسرے دن جا کر حضرت عمرؓ کو سنایا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس میں تو وہ درد نہیں ہے، اس نے کہا: امیر المومنین! زیدؓ آپ کے بھائی تھے، میرے بھائی نہ تھے"۔(۱۰)

بہرحال راقم الحروف نے اپنے خط (بنام جگن ناتھ آزاد) مرسلہ ۱۳ر دسمبر ۸۰ء کے ساتھ جگن ناتھ آزاد صاحب کو "سرگذشت الفاظ" بھیج دی (جو میرے پاس پہلے سے موجود تھی) اور علامہ شبلی کی شعر العجم کے حوالے سے آزاد صاحب کے بیان کردہ واقعے کی عدم صحت کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

خط میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ناچیز سے بہار یونیورسٹی سے "اقبال اور عشق رسول" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا مشورہ بھی طلب کیا اور ایک غزل بھی نظر ثانی کے لیے بھیج دی، جس کا مطلع تھا:

تری چشم کرم ساقی اگر اک بار ہو جائے فروغ مے سے دل جلوہ گہ انوار ہو جائے (۱۱)

جگن ناتھ آزاد صاحب نے جموں یونیورسٹی سے ۲۲ دسمبر ۸۴ء کو ناچیز کے خط کا جواب دیا:

(۵)

۲۲ دسمبر ۸۴ء

محب گرامی قدر! آداب۔ نیا سال مبارک۔ عنایت نامہ ۱۳ر دسمبر کا اور اس کے ساتھ ہی "سرگذشت الفاظ" موصول ہوئی، سراپا سپاس ہوں۔ ع: من بہ بوئے مست ساقی پُر دہد پیمانہ ہا!

اس دوران میں "سرگذشت الفاظ" دیکھنے کا موقع نہیں ملا، میں یہ کتاب پہلی بار آپ ہی کی عنایت سے دیکھ رہا ہوں: کرم کردی الٰہی زندہ باشی۔

"اقبال اور کشمیر" ۱۹۷۷ء کے بعد نہیں چھپی، ناشر ۷۹ء سے کہہ رہا کہ کتاب ختم ہے اور بہت جلد اس کا نیا ایڈیشن چھاپ رہا ہوں، اب خدا جانے صورت حال کیا ہے۔ آج کل ناشرین بالخصوص اردو کے۔ قریب قریب سب اسی مزاج کے ہیں۔

مولانا شبلی کے بیان کیے ہوئے واقعے کے بارے میں مجھ سے جو سہو ہوا ہے اس کی تصحیح کے

لیے صمیم قلب سے شکر گزار ہوں، ''اقبال اور کشمیر'' کا نیا ایڈیشن جب بھی چھپے گا تصحیح کر دی جائے گی، آپ کا خط میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے، ریکارڈ یابی کے ساتھ تاکہ اس بات سے خالی الذہن نہ ہو جاؤں، اس رہنمائی کے لیے دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

''اقبال اور عشق رسولؐ'' بہت عمدہ موضوع ہے، مقالے تو اس موضوع پر بہت چھپے ہیں، غالباً ایک کتاب بھی میری نظر سے گزری ہے یا دو کتابیں، اب ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے، (ہاں یاد آگیا ''اقبال اور محبت رسولؐ'' محمد طاہر فاروقی کی کتاب کا نام ہے) لیکن ہر شخص کے لکھنے کا اپنا انداز ہوتا ہے، اس لیے میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ ایک موضوع پر ایک کتاب پہلے سے موجود ہے تو اس موضوع پر دوسری کتاب نہیں لکھی جانی چاہیے، اور یہ کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں اور جو اس وقت سامنے نہیں ہیں، وہ پاکستان کے مصنّفین کی ہیں، آپ اس موضوع کا رجسٹریشن کرا لیجیے، میں اس سلسلے میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں، خدا کرے آپ کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے، اس ضمن میں اپنے ناچیز خیالات آپ کے سامنے رکھتا رہوں گا۔

ہاں یاد آیا کہ آپ کے پاس علامہ مرحوم کی یہ نعت موجود ہے جو انھوں نے ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں کہی تھی:

اے کہ بر دل ہا رموز عشق آساں کردہ ای سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای (۱۲)

اگر نہ ہو تو لکھیے، میں آپ کو بھیج دوں، ویسے یہ میری نئی کتاب ''شاعر مشرق'' کی جلد اول میں آرہی ہے۔

''ادبیات'' تو مدت ہوئی بند ہو چکا، صرف تین یا چار شمارے نکلے تھے، جاری ہوتا تو آپ کی غزل اس میں نمایاں طور سے چھپتی، بہت عمدہ غزل ہے، ''جلوہ گہہ انوار'' میں جلوہ کی ہائے مختفی اشباع کے ساتھ آرہی ہے، اگر مصرعے کے آخر میں آئے تو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، جیسے:

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ

درمیان میں آئے تو عیب، (عیب تو ہر اعتبار سے ہے لیکن مصرعے کے آخر میں برا نہیں معلوم ہوتی بلکہ مصرعے میں موسیقی کا عنصر بڑھ جاتا ہے)، یہ خامی میرے کلام میں کئی جگہوں پر ہے لیکن چوں کہ اصول کی بات ہے، سوچا آپ کو بتا دوں (اگرچہ میں خود اس پر پوری طرح سے عمل نہیں کر پایا)۔

آپ نے جوابی لفافہ بھیج کر شرمندہ کیا ہے، اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، بہرصورت آپ

نے بھیج دیا ہے تو میں استعمال کر رہا ہوں۔

آئندہ ہفتے دہلی سے میری دو کتابوں کی چند جلدیں آنے والی ہیں، ایک ''نشانِ منزل'' (تنقیدی مقالات کا مجموعہ) اور دوسری ہے ''محمد اقبال - ایک ادبی سوانح حیات''، اگر یہ کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں تو لکھیے تا کہ آپ کی نذر کردوں ؎: حیف بر جان سخن گر بہ سخنداں نہ رسد۔

خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔ نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

بہار یونیورسٹی مظفرپور سے جب ''اقبال اور عشقِ رسولؐ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن ہو گیا تو راقم الحروف نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو موضوع کا خاکہ ارسال کر کے ان سے تعاون کی گذارش کی، انہوں نے اپنے مکتوب مرسلہ ۱۴؍ جولائی ۸۶ء میں تحریر فرمایا:

(۶)

Gandhi Nagar, Jammu Tavi
(J&K)-80004

۱۴؍ جولائی ۸۴ء

محبی! تسلیم۔ عنایت نامے کی رسید بڑی تاخیر سے دے رہا ہوں، گذشتہ پانچ سات ماہ مسلسل سفر میں گزرے، بیرون ملک بھی اور اندرون ملک بھی، یہاں میز پر کاغذات کے انبار لگ گئے ہیں، تاخیر کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

آپ کا خاکہ بہت مناسب ہے، اصناف میں رباعی کا اضافہ کر لیجیے، اگر چہ علامہ اقبال نے رباعی کے مقررہ اوزان میں صرف چار رباعیات ہی کہی ہیں، ایک فارسی میں اور تین اردو میں، لیکن انہوں نے ارمغان کی رباعیات کو رباعیات ہی کہا ہے، اپنے ایک خط میں اور ان رباعیات میں آپ کے موضوع سے متعلق رباعیات موجود ہیں، اس وقت ''ارمغان حجاز'' سامنے نہیں ہے، غالباً مذکورہ رباعیات اس باب میں شامل ہیں: ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر۔

مجھے یقین ہے کہ موضوع کی برکت سے آپ کا مقالہ بہت عمدہ ہوگا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

"اقبال اور عشق رسول" کے موضوع پر بہار یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن تو ہو گیا لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی، راقم الحروف ان دنوں سخت بیمار ہو گیا اور بیماری مُمتَد ہو گئی، اس کے علاوہ اور بہت سی گھریلو الجھنیں پیدا ہو گئیں، اس طرح پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

ماکل ما یتمنی المرء یدرکه تجر الریاح بما لاتشتھی السفن

"ایسا نہیں کہ آدمی اپنی ہر مراد کو حاصل کر لے، کیوں کہ (بسا اوقات) ہوائیں کشتیوں کی جانب مخالف میں چلا کرتی ہیں۔"

ڈنمارک سے نصر ملک صاحب نے ماہنامہ انشاء (کلکتہ) کے مدیر جناب ف س، اعجاز کے نام اپنے ایک خط میں علامہ اقبال کو احمدی (قادیانی) ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، نصر ملک صاحب کا خط انشا کے مشترکہ شمارہ جولائی اور اگست ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔

راقم الحروف نصر ملک کے خط کے رد عمل میں "اقبال اور احمدیت" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا جو انشاء (۱۴) میں شائع ہوا اور کئی ارباب فکر و نظر نے اس مضمون کو پسند کیا، اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ خیال پیدا ہوا کہ اس پر تفصیل سے مضمون لکھنا چاہیے، چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر جگن ناتھ کو ایک طویل خط لکھا اور ان کا نقطۂ نظر جاننا چاہا، لیکن آزاد صاحب نے اپنے نقطۂ نظر سے مطلع نہیں کیا، البتہ انہیں دنوں ایک پوسٹ کارڈ پر ۷/اپریل ۲۰۰۱ء کا لکھا ہوا آزاد صاحب کا ایک خط ۲۰/اپریل ۲۰۰۱ء کو موصول ہوا، آزاد صاحب نے تحریر فرمایا تھا:

(۷)

Gandhi Nagar
Jammu Tavi,(J&K)

۷/اپریل ۲۰۰۱ء

محب مکرم! آداب۔ بہت دن ہوئے آپ کا عنایت نامہ ملا تھا لیکن وہ کاغذات میں کہیں اوپر نیچے ہو گیا ہے اور تلاش کے باوجود نہیں مل سکا ہے۔

میں اپنی اس کوتاہی پر نادم ہوں اور معذرت خواہ، جو کچھ آپ نے اپنے خط میں لکھا تھا اسے اگر دوبارہ ارشاد فرمادیں تو ممنون ہوں گا۔

والسلام
خیر اندیش
جگن ناتھ آزاد

مذکورہ خط کی نقل راقم الحروف کے پاس موجود تھی، چنانچہ ۲۱ مئی ۲۰۰۱ء کو وہ خط آزاد صاحب

کو رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کردیا۔

۱۳/جون ۲۰۰۲ء کو مشاہیر کے خطوط بنام جگن ناتھ آزاد کی پہلی جلد کا مجموعہ ''سلام و پیام'' (مرتبہ امین بنجارا) کا پیکٹ موصول ہوا، اس مجموعہ میں ناچیز کا وہ خط بھی شامل ہے جس کو آزاد صاحب کی طلب پر ناچیز نے ان کو بھیجا تھا، وہ خط سلام و پیام میں صفحہ ۲۴۸ سے ۲۵۱ تک چار صفحات پر مشتمل ہے (۱۵)، یہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب کی ذرہ نوازی تھی کہ انہوں نے اس کم سواد کے خط کو مشاہیر کے خطوط میں شامل کیا، ناچیز نے اپنے اس خط میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال احمدی نہیں تھے، ایسی صورت میں اس خط کا مشاہیر کے خطوط میں آزاد صاحب کا شامل کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جگن ناتھ آزاد صاحب بھی علامہ اقبال کو احمدی نہیں سمجھتے تھے۔

بہرحال ''سلام و پیام'' موصول ہونے کے بعد راقم الحروف نے اپنا مدلل تفصیلی مضمون ''اقبال اور احمدیت'' مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم (۱۹۳۷-۲۰۰۸ء) کو بھیج دیا جس کو انہوں نے اکتوبر معارف ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع کیا۔

۲۱ مئی ۲۰۰۲ء کے بعد سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے رابطہ قائم نہیں کرسکا کہ وہ میری طویل اور شدید علالت کا دور تھا، لیکن یہاں میں کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہوں گا کہ یہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ہی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ شعر و شاعری میں میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگئی اور ۱۹۸۱ء سے تواتر کے ساتھ میرا کلام معارف جیسے معیاری رسالے میں محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۹۱۱-۱۹۸۷ء) کے دور ادارت سے شائع ہونے لگا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی علیہ الرحمۃ بھی اپنے دور ادارت میں پابندی سے میرا کلام معارف میں شائع کرتے رہے، میرے خطوط اور مضامین بھی انہوں نے معارف میں شائع کیے، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی زید مجدہ اور جناب مولانا عمیر الصدیق ندوی مدظلہ نے بھی میرے کلام کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں کی: ایں سعادت بزور بازو نیست۔

۳۰ جولائی ۲۰۰۴ء کو تقریباً سات بجے شام کے وقت ناظمہ منزل دودھ پور علی گڑھ میں مختار الدین احمد آرزو (۱۹۲۴-۲۰۱۰ء) نے دوران گفتگو یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد انتقال کرگئے، اخبار منگوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء کو آزاد صاحب نے دنیائے بے ثبات کو خیرباد کہا: اللہ بود باقی و باقی فانی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی وفات پر راقم الحروف نے ایک طویل نظم لکھی جو پہلے معارف ستمبر ۲۰۰۴ء

کے شمارے میں شائع ہوئی، اس کے بعد ہماری زبان نئی دہلی کے جگن ناتھ آزاد نمبر یکم تا ۲۸ نومبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں چھپی، پھر شملہ (ہماچل پردیش) سے نکلنے والے جدید فکروفن میں اشاعت پذیر ہوئی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک عظیم شاعر، وسیع النظر عالم، بے باک انشا پرداز اور بیدار مغز دانشور تھے، آزاد صاحب کی صحت مند انداز فکر کی حامل شاعری کو ارباب فکرونظر نے بہ نظر تحسین دیکھا، کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی ان کی فکر انگیز شاعری میں احترام انسانیت کا درس ملتا ہے، اپنی دلنشیں شاعری اور کیف آگیں نغموں سے انہوں نے مہر واخوت کا ماحول پیدا کیا اور اپنی دل گداز شاعری کے چشمۂ صافی سے تعصب اور نفرت کے شعلوں کو بجھانے کا کام کیا۔

اسلام سے آزاد صاحب کی سچی محبت اور رسول اللہؐ سے بے پناہ عقیدت اور رسول اکرمؐ کی والہانہ مدح وثنا کی وجہ سے بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ''رحمت'' اس کے غضب پر غالب آجائے اور آزاد صاحب کی روح کو تسکین نصیب ہو۔

مآخذ اور حواشی

(۱) ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی، ماہر القادری کی آخری سانسیں، فاران دسمبر ۱۹۷۸ء، ماہر القادری نمبر، کراچی، ص ۷۷۳ (بحوالہ سپاری، لاہور)۔ (۲) حوالہ بالا، ص ۳۸۰، ۳۸۱۔ (۳) پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جن جن اشعار میں اسقام کی نشاندہی کی تھی ناچیز نے ان کی تصحیح کر لی۔ (۴) ناچیز کو معلوم نہیں تھا کہ ادبیات کا سالانہ چندہ تیس روپے ہے، اس لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیا تھا۔ (۵) پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے، ماہنامہ ادبیات، اپریل ۱۹۸۰ء، شہیدی چوک، جموں توی، ص ۶۰۔ (۶) اعجاز صدیقی ماہنامہ شاعر کا مشترکہ شمارہ، دسمبر ۱۹۷۳ء، جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۴۔ (۷) صادق نسیم، اقبال منفرد نعت گو، ماہنامہ ادبیات، اپریل ۱۹۸۰ء، شہیدی چوک، جموں توی، ص ۲۳۔ (۸) جگن ناتھ آزاد، ''اقبال اور کشمیر''، ناشر علی محمد اینڈ سنز بک اینڈ پبلشرز، سری نگر، ص ۹۰۔ (۹) حوالہ بالا، ص ۱۲۸۔۱۲۹۔ (۱۰) علامہ شبلی نعمانی: موازنہ انیس و دبیر، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص ۷۔ (۱۱) ناچیز نے اس مصرعے کو یوں کر دیا: ''فروغ مے سے دل مے خانۂ انوار ہو جائے''۔ (۱۲) یہ نعت ناچیز کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ (۱۳) یہ دونوں کتابیں بھی میرے پاس تھیں۔ (۱۴) وارث ریاضی ''اقبال اور احمدیت'' ماہنامہ انشا زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳، ۲۰۰۷ء، ص ۴۴ تا ۴۶۔ (۱۵) امین بنجارا، مرتب سلام و پیام، جلد اول، ایورگرین پبلشرز جموں توی (انڈیا) ص ۴۴۸ تا ۴۵۱۔

اخبار علمیہ

''خلائی مخلوق سے انسانی روابط کا دعویٰ''

امریکی سائنس دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ترقی یافتہ خلائی مخلوق نے انسانوں سے رابطہ کے لیے ریڈیو سگنل بھیجے ہیں۔ ان کے مطابق انہوں نے خلا سے ایسے سگنل دریافت کر لیے ہیں جو کسی ذہین خلائی مخلوق کی جانب سے ہو سکتے ہیں۔ غیر ملکی میڈیا رپورٹس کے مطابق سائنس دانوں نے یہ دعویٰ سورج جیسے ۳۱ ستاروں کی سمت سے آنے والے کروڑوں سگنلوں کو کھنگالنے اور ان میں سے محسوس ہونے والے سگنلوں کا مزید تفصیلی اور محتاط تجزیہ کرنے کے بعد کیا ہے۔ واضح رہے کہ کائنات میں اب تک زمین کے علاوہ کسی بھی دوسری جگہ زندگی دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ سائنسی بنیادوں پر ماہرین کا مفروضہ ہے کہ صرف ہماری کہکشاؤں ملکی وے میں، زمین جیسے لاکھوں سیاروں پر زندگی موجود ہو سکتی ہے۔ ماہرین نے ۲۰۱۸ء اور ۲۰۱۹ء میں اس دوربین کے ذریعہ خلا سے آنے والے کھربوں ریڈیو سگنلز ریکارڈ کیے اور مختلف جدید تکنیک اختیار کرتے ہوئے ان کا جائزہ لیا تاکہ ان میں سے قدرتی اور ممکنہ طور پر غیر قدرتی سگنل الگ کیے جا سکیں، لیکن ابھی اس رابطہ یعنی ان سگنلوں کا کوئی واضح مطلب رپورٹ میں درج نہیں ہے۔ (اعتماد، حیدرآباد ۱۲ نومبر ۲۰۲۰ء، ص ۵)

''سینی ٹائزر کی ایک نئی مشین کی ایجاد''

فلسطین کی ایک ۳۷ سالہ خاتون ہیبہ ہندی نے سینی ٹائزر کی ایک ایسی مشین بنائی ہے جو صرف دو سے تین سکنڈ میں کسی بھی شخص کا جسمانی درجۂ حرارت معلوم کرتی ہے۔ ہاتھ دھونے والے سینی ٹائزر کی پھوار کرتی، اس کے بعد جسم اور پیروں پر ایتھانول اور کلورین کا اسپرے کرتی ہے۔ مشین کا ڈیزائن اس قدر سادہ ہے کہ اسے بچہ، بوڑھا، کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔ یہ مشین ماحول دوست اور توانائی سے بچت بھی کرتی ہے۔ اسمارٹ فون کے ذریعہ اس کو کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں چار سنسر بھی لگے ہیں۔ پوری مشین فلسطینی ماہرین نے ڈیزائن کی ہے۔ ۲۰۰۷ء سے اسرائیل نے

فلسطین کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اسرائیلی پابندیوں کے سبب بہت سے مسائل اور الجھنوں کا شکار بھی ہے۔اس کے باوجود یہ پوری کی پوری مشین فلسطین ہی میں بنائی گئی ہے۔ ہیبہ نے بتایا کہ اگر کوئی بخار کے ساتھ اس مشین کے سامنے سے گزرے تو یہ الارم بجا کر خبردار بھی کرتی ہے۔ کل کارخانوں، اسکولوں اور عوامی مقامات پر لوگوں کو دور رکھنے میں یہ مدد بھی دیتی ہے۔ غزہ میں یہ مشین اقوام متحدہ، یونیسکو اور دیگر اہم اداروں اور بازاروں میں بھی نصب کی گئی ہے جہاں داخل ہونے سے پہلے لوگوں کو اس مشین سے گزرنا پڑتا ہے۔ مقبوضہ غزہ میں اس وقت کووڈ-۱۹ کے شکار مریضوں کی تعداد ۸۰۰۰ سے زائد ہے اور ۳۰/افراد لقمۂ اجل ہو چکے ہیں۔ (اخبار مشرق کلکتہ، ۹ دسمبر ۲۰۲۰ء، ص ۶)

''بجلی پیدا کرنے کا انوکھا طریقہ''

سعودی عرب کے دو نوجوان سائنس دانوں نے بجلی پیدا کرنے کا ایک نیا اور انوکھا طریقہ ایجاد کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پیدل چلنے سے ضرورت کے مطابق بجلی پیدا کی جاسکتی ہے، دونوں ماہرین نے امریکی مرکز ایجادات میں اپنا نظریہ درج کرایا ہے۔ جس کے رو سے فرش کے نیچے رکھے چھوٹے پسٹنوں پر چل کر بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ بجلی کے چھوٹے جنریٹر سے جڑے ٹیوب میں مائعات یا گیسوں کی گردش سے پیدا کرسکتی ہے۔ سعودی عرب کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں توانائی انجینئرنگ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر حسین باصی اور عبدالعزیز میڈیکل انجینئرنگ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید خطیب نے مشترکہ طور پر یہ تخیل پیش کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ لوگوں کی آمد و رفت یا ورزش کے لیے پیدل چلنے کی خواہش سے یہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ (صحافی دکن، حیدرآباد، ص ۴، ۱۱/دسمبر ۲۰۲۰ء)

''بہروں کے لیے سائن لینگویج سافٹ ویر کی ایجاد''

اب محروم سماعت افراد کے لیے ایک نئی ایجاد کی گئی ہے جو بولے جانے والے الفاظ کو ویڈیو ماڈل یا ڈیجیٹل اوتار سے ظاہر کردیتی ہے۔ اس طرح سماعت سے محروم افراد تک اپنی بات پہنچائی

جاسکتی ہے۔ برطانیہ میں مصنوعی ذہانت سے یعنی اے آئی سے وابستہ کمپنی نے یہ سافٹ ویر بنایا ہے جو نیورل نیٹ ورک کے طرز پر کام کرتا ہے۔ جیسے ہی کوئی گفتگو کرتا ہے سائن لینگویج (اشاروں کی زبان) ادا کرنے والے اوتار سے ویڈیو کی صورت میں ادا ہوتی ہے۔ اس طرح عین حقیقی تصاویر والی ویڈیو ظاہر ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ماہر اپنے اشارے سے کچھ سمجھا رہا ہو۔ بیک وقت بہت سے افراد اسے ویڈیو کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس اہم منصوبہ کے لیے یونیورسٹی آف بررے کے بین سنڈرز اور ان کے ساتھیوں نے نیورل نیٹ ورک بنایا ہے جو بولے گئے الفاظ کو اشاروں کی زبان میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کے بعد سائن ایج کمپنی نے اس کے لیے ایک انسانی ڈھانچہ اور تھری ڈی ماڈل بنایا ہے۔ ایک اور ٹیم نے اشاروں کی حقیقی زبان کے لیے مواد اور تصاویر پیش کی ہیں۔ اس سے قبل گوگل نے ویڈیو کال کے دوران سائن لینگویج ظاہر کرنے والی ایک ایپ بنائی ہے لیکن اس میں بعض خامیاں تھیں۔ تاہم سائن لینگویج کا نیا الگورتھم اس سے بہت بہتر ہے۔ (تاثیر پٹنہ، ۳ دسمبر ۲۰۲۰ء، ص ۷)

''لفظ ''اچھا'' کیمبرج ڈکشنری میں شامل''

ایک خبر کے مطابق دنیا کے معتبر و مستند لغات میں ''کیمبرج ڈکشنری'' کا شمار ہوتا ہے۔ اس میں اردو کا مشہور لفظ ''اچھا'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ڈکشنری کے مطابق لفظ اچھا کا مطلب کسی بات کو ماننا یا اس سے اتفاق کرنا شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس ڈکشنری نے سال کے ''ورڈ آف دی ایئر'' کا بھی اعلان کیا ہے۔ یہ لفظ ''قرنطیہ'' ہے۔ اس لیے کہ یہ لفظ سب سے زیادہ تلاش کیے جانے والے الفاظ میں تیسرے نمبر پر ہے۔ کیمبرج ڈکشنری نے اس سال کرونا وائرس سے متعلق الفاظ بھی اپنی ڈکشنری میں شامل کیا ہے جس میں ''لاک ڈاؤن'' اور ''پینڈمک'' جیسے الفاظ شامل ہیں۔ (اخبار مشرق، کلکتہ، ۹ دسمبر ۲۰۲۰ء، ص ۱)

(ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب ٹامل ناڈو

ٹامل ناڈو

مکرمی! سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف بابت دسمبر ۲۰۲۰ء کے شمارے میں ڈاکٹر راہی فدائی صاحب کا مضمون بعنوان ''علامہ سید سلیمان ندوی اور مشاہیر جنوب'' بڑا علمی اور معلوماتی ہے۔ راہی فدائی صاحب جنوب کے حوالے سے نئی اور نادر معلومات اپنے اشہب قلم سے پیش کرتے ہیں، اس سلسلے میں ان کی کئی ایک تصانیف بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان تمام کاوشوں کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں، اپنے مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے جنوب ہند، قدیم علاقہ مدراس کا کل چار بار سفر کیا ہے۔ پہلی بار ۱۹۱۲ء میں اور دوسری بار ۱۹۲۵ء میں اور تیسری بار ۱۹۲۷ء میں اور آخری مرتبہ ۱۹۳۷ء میں ورود مسعود ہوا۔ اس کے بعد کبھی اس جانب سفر کا موقع نہ ملا۔ یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ علامہ کا آخری اور پانچواں سفر علاقہ مدراس کی جانب دسمبر ۱۹۴۴ء میں ''مورخین ہند کانفرنس'' کی صدارت کی غرض سے ہوا ہے، معارف بابت اپریل ۱۹۴۵ء میں علامہ رقم طراز ہیں ''مدراس میں اواخر دسمبر ۱۹۴۴ء میں مورخین ہند کانفرنس تھی، جس کے ایک شعبہ کی صدارت کے لیے مدراس کا سفر کیا گیا''۔ اس سفر میں علامہ نے جامعہ دارالسلام عمر آباد میں دو دن قیام فرمایا اور ایک دن شہر پرنامبٹ جو راقم کی بستی ہے وہاں شیخ الحدیث مولانا عبدالواحد عمری رحمانی (شیخ الحدیث جامعہ دارالسلام) کے مہمان ہوئے اور مولانا کی ذاتی لائبریری سے سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد پر بقلم خود یہ آیت کریمہ ''فَبَشِّرۡ عِبَادِ ۝ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ'' تحریر فرمایا۔ (تذکرہ واجدی، مرتب مولانا محمد ثناء اللہ عمری، ایم اے، عثمانیہ)

فقط والسلام

ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری

مکتوب کاندھلہ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

معارف کا نومبر کا شمارہ ملا، دیکھا، اس کے دو مضامین کے بارے میں چند معروضات پیش ہیں:

قرآن کریم کے منظوم تراجم میں سے، غالباً صرف پاکستان میں شائع تراجم پیش نظر ہیں، اگرچہ ہندوستان میں چھپے بعض تراجم کا بھی تذکرہ ہے، مگر ناتمام سا معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں ۱۹۴۷ء (۶۷-۱۳۶۶ء) کے بعد کئی منظوم ترجمے چھپے ہیں، جو غالباً مرتبین کے سامنے نہیں ہیں۔

کیف بھوپالی صاحب کے منظوم ترجمۂ قرآن، مفہوم القرآن کا کچھ تذکرہ ہے جو ناتمام ہے، مفہوم القرآن کا اول ایک پارہ ہی چھپا تھا، اس طباعت کے چوبیس پچیس سال بعد مکمل ترجمۂ قرآن بھی شائع ہوگیا تھا، لیکن اس کو وضاحتی یا تشریحی ترجمہ کہا جاسکتا ہے، تفسیر کہنا مشکل ہے۔

کبیر کوثر صاحب کے ترجمہ قرآن کا، نظام حیات کے عنوان سے، مختصر سا تذکرہ ہے اور لکھا ہے کہ یہ ترجمہ ۸۶-۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں بھوپال سے شائع ہوا تھا، کیف بھوپالی صاحب کے ترجمہ کے تعارف کی طرح یہ تعارف بھی ناتمام ہے۔

علامہ کبیر کوثر نے، قرآن کریم کا اردو میں جو منظوم ترجمہ شروع کیا تھا، اس کی مختلف سورتیں، الرحمٰن، یٰسین، ملک وغیرہ علاحدہ علاحدہ چھپتی رہیں، اس طرح تقریباً اسّی سورتوں کے ترجمے علاحدہ شائع ہوئے، بعد میں مکمل قرآن مجید کا منظوم ترجمہ، یکجا القرآن المنظوم کے نام سے شائع کیا، جس کے ساتھ علامہ عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ چھپا تھا، اس کی ہندی ترجمانی، حفظ الکبیر صاحب کے قلم سے شامل ہے۔

یہ ترجمہ القرآن المنظوم کے نام سے الکبیر پبلی کیشنز دلی سے ۱۴۱۴ھ (۱۹۹۴ء) میں شائع ہوا، دس دس پاروں پر مشتمل تین جلدوں میں ہے، اس ترجمہ کا ۸۶-۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں آغاز ہوا تھا، ۱۲-۱۴۱۱ھ (۱۹۹۱ء) میں مکمل ہوا۔

ایک اور منظوم ترجمہ ''پیغام قرآن مجید'' ہے، جو جناب سعد حسین سعد (آئی اے ایس) حیدرآباد کی کاوش ہے، اس میں جناب سعد حسین نے، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے قرآن کریم کے اردو ترجمہ کو نظم کا پیراہن بخشا ہے، اردو کے منظوم ترجمہ کے ساتھ، انگریزی ترجمہ پر بھی توجہ ہے۔ ترجمہ سورۂ فاتحہ کا انداز یہ ہے:

ہے فقط اللہ کو زیبا ہر اک حمد و ثنا خیر وخوبی کا ہے سرچشمہ وہی واحد خدا

پالنے والا جہانوں کا ، سبھی مخلوق کا مالک ومختار عالم، قادر مطلق خدا
خالقِ مخلوقِ عالم، خالق ارض وسماء اپنی مخلوقات کا ہے چاہنے والا بڑا

مترجم نے یہ ترجمہ مثنوی کی بحر میں کیا ہے اور اکثر اشعار کے اوزان کی بھی نشاندہی کی ہے، کہ کون سا شعر، عروضی نقطۂ نظر سے کس بحر میں ہے۔

اس میں سعد حسین صاحب نے، انگریزی میں دو ترجموں کی کوشش کی ہے، پہلا ترجمہ عام انگریزی میں، دوسرا بائبل کی زبان میں کیا ہے۔ اس ترجمہ کا جو عکس ہمارے سامنے ہے، افسوس کہ وہ بہت صاف نہیں، اس لیے بعض الفاظ صحیح نہیں پڑھے جاسکے، جو کچھ پڑھا گیا اور واضح ہے وہ یہ ہے کہ:

All Praise to be Allah The Lord of the World.

اس ترجمہ کا جو حصہ میرے سامنے ہے، وہ صرف سورۂ انفطار تک ہے، بعد میں یہ ترجمہ کہاں تک پہنچا، کس قدر حصہ کی تکمیل ہوسکی، اس کا علم نہیں، لیکن اردو کے ساتھ دو، دو انگریزی ترجمے، اس تالیف وکاوش کا نادر امتیاز ہیں، یہ حصہ فل اسکیپ کے ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے، غالباً چھپا نہیں ہے۔

اس ترجمہ کو مترجم نے، پیغام قرآن مجید کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے سرورق پر یہ تعارف تحریر ہے: ''منظوم پیغام قرآن مجید، پارہ عمّ''۔

''اردو نثری ترجمہ، مولانا شیخ الہند حضرت محمود الحسن صاحب قبلہ، اردو میں منظوم مفہوم، قوسین میں مختصر تشریح وتفسیر کے ساتھ، انگریزی میں (غیر انجیلی عصری زبان میں) نثری مفہوم (قوسین میں) مختصر تشریح وتفسیر کے ساتھ''۔

منظوم، مضامین القرآن المجید: برگیڈیر ڈاکٹر مختار عالم نے، قرآن مجید کی مختلف سورتوں کے مضامین کو، اردو میں نظم کیا ہے۔ یہ تمام سورتوں کا انتخاب یا ترجمہ نہیں ہے بلکہ کچھ سورتوں کی کچھ آیتیں، مترجم نے اپنے ذوق کے مطابق، ترجمہ کے لئے منتخب کیں ہیں اور ان کو اپنے سادہ الفاظ میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ کاوش، ترجمہ اور شعریت دونوں پہلوؤں سے جاذب توجہ نہیں ہے، لیکن مترجم کے خلوص کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ترجمہ، یا خلاصہ آیات مضامین القرآن المجید، دوسو بہتر ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے، آخری ایک صفحہ پر اس کی تصحیح کی سند، دوسرے پر خاتمہ بالخیر چھپا ہوا ہے۔

یہ ترجمہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے، نفیس آرٹ پیپر

پر چھپا ہے، اعلیٰ درجہ کی طباعت ہے، جلد اور ٹائٹل بھی خوبصورت، دیدہ زیب اور نفیس ہے۔

اس مضمون میں حکیم محمد اشرف کے منظوم ترجمہ سورۂ یوسف کا، کتاب مستطاب کے عنوان سے تذکرہ ہے، جو ناتمام اور غیر واضح ہے۔ تفسیر سورۂ یوسف منظوم، مولانا حکیم محمد اشرف (خلف مولانا امام الدین کاندھلوی) کی تالیف ہے، جو ربیع الآخر ۱۲۱۹ھ (جولائی، اگست ۱۸۰۴ء) میں لکھی گئی تھی، اس تاریخ تالیف کی، تفسیر سورۂ یوسف کے خطی اور مطبوعہ، دونوں طرح کے متعدد نسخوں میں صراحت ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو: "مطبوعہ قیومی کانپور ۲۲-۱۳۲۱ھ (۱۹۰۴ء) اور گلزار احمدی مراد آباد ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (نومبر ۱۹۱۴ء)"۔

تفسیر سورۂ یوسف سب سے پہلے مطبع محمدی، بمبئی سے ۱۲۶۴ھ میں چھپی تھی، اس طباعت کے سرورق پر اس کا نام دو سطروں میں چھپا ہوا ہے، اوپر کتاب مستطاب لکھا ہے، نیچے تفسیر سورۂ یوسف! شاید یہیں سے مضمون نگار صاحبان کو مغالطہ ہوا، انہوں نے اس کا نام کتاب مستطاب خیال فرمالیا جو صحیح نہیں۔ تفسیر سورۂ یوسف، اندازاً چالیس پینتالیس مرتبہ تو ضرور چھپی ہے اور ہنوز شائع ہوتی رہتی ہے، اس کی تقریباً چوبیس پچیس طباعتیں میری نظر سے گذری ہیں، جس میں سے پندرہ کے قریب میرے ذاتی ذخیرہ میں موجود ہیں، ان میں سے کسی پر بھی اس کا نام کتاب مستطاب درج نہیں، ہر ایک پر تفسیر سورۂ یوسف منظوم چھپا ہوا ہے۔

یہ تفسیر جیسا کہ مصنف نے صراحت بھی کی ہے، امام غزالی کی تفسیر سورۂ یوسف کا ترجمہ ہے، تفسیر سورۂ یوسف کے، ہند پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں، بیس سے زائد قلمی نسخے معلوم ہیں، طباعتیں بھی کثرت سے دستیاب ہیں۔

اس مضمون میں حافظ غلام مرتضی جنوں کے ترجمہ سورۂ نور کا بھی نام آیا ہے، یہ بھی مشتبہ معلوم ہوتا ہے، حافظ غلام مرتضیٰ جنوں کا، آخری پارۂ عم کا اردو منظوم ترجمہ ہے، جو ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کی تالیف ہے، اس کا معروف نام تفسیر مرتضوی ہے۔ تفسیر مرتضوی کی پہلی طباعت، مطبع سنگی کلکتہ کی ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) کی ہے، ایک مرتبہ اور چھپی ہے، اس کے چند قلمی نسخے بھی معلوم ہیں، ایک صاف پرانا خطی نسخہ، جس پر سنہ کتابت درج نہیں، ہمارے ذخیرہ میں بھی موجود ہے۔

اسی شمارہ میں سلسلہ شطاریہ پر بھی ایک تحریر ہے، اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سلسلہ شطاریہ کے مشہور مصنّفین اور اس سلسلہ کی تعلیمات اور فکر کو عام کرنے والوں میں، ایک خاصا متعارف نام، صوفی محمد شریف جھنجھانوی کا بھی ہے، جو اس وقت کی علمی دنیا میں صوفی دانشمند کے نام سے معروف

تھے اوران کو عموماً تذکرہ نگاروں نے، صوفی شریف ابن شیخ چوہر جھنجھانوی (جھنجھانہ، Jhinjhana ضلع شاملی، مظفرنگر، یوپی] لکھا ہے، خود صوفی شریف کی تصانیف میں بھی اسی طرح ہے۔

صوفی شریف یا صوفی دانش مند جھنجھانوی، اکبر کے دور کی علمی شخصیات میں گنے جاتے ہیں۔ نامور محقق محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے، کہ اکبر کے حکم پر جن لوگوں نے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کئے تھے، ان میں صوفی شریف یا دانشمند جھنجھانوی بھی شامل تھے۔

صوفی شریف، علامہ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے فاضل شاگرد اور خلیفہ تھے، صوفی شریف نے سلسلۂ شطاریہ کی تعلیمات عام کرنے میں بڑی خدمات انجام دیں، صوفی شریف کی جن کتابوں کا مجھے علم ہے اوران کے خطی نسخے و مطبوعہ دستیاب ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ خلاصۃ الاسرار در کشف مشرب شطار ۲۔ لطائف الصوفیۃ مؤلفہ: ۱۰۰۶ھ (۹۸-۱۵۹۷ء) جو صوفی شریف کی معلوم تصانیف میں سب سے بڑی ہے، اس کے ایک خطی نسخہ کا فوٹو ہمارے ذخیرہ میں ہے۔ ۳۔ عجائب الافکار ۴۔ اطوار در حل اسرار شطار ۵۔ تلویحات الصوفیۃ ۶۔ یاس انفاس ۷۔ مصباح الاشباح مؤلفہ: ۱۰۱۰ھ (۲-۱۶۰۱ء) اس کا ایک خطی نسخہ ۱۰۶۹ھ (۵۹-۱۶۵۸ء) کا مکتوبہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔ ۸۔ الحقیقۃ الانسانیۃ الکاملۃ، ان میں سے تین چھوٹے رسائل مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں۔

صوفی شریف جھنجھانوی کی تالیفات اور ترجموں کے چند خطی نسخوں کی معلومات کے لیے دیکھیے:

A Descriptiri Catalogue of Persian Translations of Indian Works, by: Prof. Shariq Husain Qasmi, 59,132- Delhi 2014

(مجھے صوفی محمد شریف، صوفی دانش مند جھنجھانوی کے حالات نہیں ملے، اہل علم سے گذارش ہے کہ اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔)

علامہ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی تصانیف میں سے "حقیقت محمدیہ" بڑے علماء اور ممتاز اہل کمال کے یہاں درس میں شامل اور قابل توجہ رہی ہے، میرے جد حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے بھی اس کا فارسی میں خلاصہ یا انتخاب کیا تھا، اس کا خطی نسخہ مفتی صاحب کے قلم سے ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔ خاندان حضرت شاہ ولی اللہ میں بھی، اس سے وابستگی اور اس پر تحریر و انتخاب کی اطلاعات ملتی ہیں اور لوگوں نے بھی اس کا خلاصہ اور شرحیں کی ہیں۔ (جناب) نورالحسن راشد کاندھلوی

ادبیات

غزل

جناب جمیل مانوی☆

جانتا ہوں سامنے ہے منزل جانانِ من
سر اٹھانے ہی نہیں دیتی ارادوں کی تھکن

کتنے یارانِ سفر آسودۂ منزل ہوئے
میں بھی اپنا راستہ طے کر چکا ہوں غالباً

چند تصویریں ہمارے آئینہ خانہ میں ہیں
کھوگئے وہ جن سے سجتی تھی ہماری انجمن

زندگی کو زندگی کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اب
زندگی باقی ہے لیکن کھوگیا ہے بانکپن

دھیرے دھیرے ذہن سے اترا جوانی کا خمار
دھیرے دھیرے عمر کی دہلیز پر اتری تھکن

موت کے ہاتھوں کی اک جنبش ہی کافی ہوگئی
کتنا نازک تھا ہماری زندگی کا پیرہن

دور رہتی تھی ہماری بزم سے افسردگی
ذہن میں تازہ ہے اب تک دوستوں کا بانکپن

اتنا تنہا کردیا ہے تیری قربت نے مجھے
خود مجھے بھی اس کا اندازہ نہیں تھا جانِ من

قاتلانِ شہر سینہ تان کر پھرتے رہے
بے گناہوں کے لیے سجتے رہے دار و رسن

اپنی اپنی عادتوں کے دونوں ہی مقتول ہیں
میں قتیلِ گوشۂ غم، تو ہلاکِ انجمن

تجھ سے تیری خوش لباسی کی شکایت کیا کریں
خاک وخوں میں لوٹتے ہیں شہر کے گل پیرہن

خود مجھے بھی اپنی خاموشی پہ حیرت ہے جمیلؔ
مصلحت آمیز تھا کتنا سکوتِ انجمن

قطعۂ تاریخ وفات

شمس الرحمٰن فاروقی نقادِ بزرگِ زبانِ اردو

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆☆

رفت در عالم جنون ادب
سوی گلزار و دشت فاروقی

از حدودِ قیاسِ اہل سخن
ہم فراتر گذشت فاروقی

بہر احبابِ ارمغان آورد
کردہ پُردست و تشت فاروقی

مدتی ہم بہ شعر و ہم در نثر
داشتہ ہفت، ہشت فاروقی

لیک دیروز ناگہان زِ اجل
راہی گور گشت فاروقی

ہاتفِ غیب گفت، کردہ کم
یک الف ”درگذشت فاروقی“

۲۰۲۱
ا ۔
۲۰۲۰ء (۱۴۴۲ھ)

☆۴۳۰، گریس اکیڈمی، نور بستی، سہارنپور۔ ☆☆نعمانی منزل J-24-H.N.4/704، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر، بی (جمال پور) علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

ذکر غزالی۔حیات وخدمات، مرتبہ جناب محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۴۴۰، قیمت ۴۰۰ روپے، پتے: دارالکتاب دودھ پور علی گڑھ، پارکھ بک ڈپو، ندوہ روڈ، لکھنؤ اور امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ۔

احیائے علوم الدین والے امام غزالی کے نہیں، یہ بہار کے ایک نوجوان محمد غزالی کے سوانح ہیں، لیکن ان کے حالات میں اثر وہی ہے جو کسی بڑے عالم کی شخصیت کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے، وہ حقیقتاً شعلہ مستعجل تھے، عین عالم شباب میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے لیکن اس شان سے کہ ان کی زندگی کی پاکیزگی اور تابندگی کی گواہی ان کے والدین، اہل خاندان، اساتذہ، احباب اور تلامذہ سب نے دی، ڈاکٹر طارق ایوبی نے ان کی تصویر کا بڑا خوبصورت عکس چند لفظوں میں پیش کردیا کہ ''غزالی بھائی بہت بڑے آدمی تھے اسی لیے بہت چھوٹے بن کر رہتے تھے''، یہ کتاب ایک کامیاب زندگی کی ایسی داستان ہے جس میں دوسروں کے لیے عزت وکامرانی اور مقاصد کی بلندی اور اس کے حصول کے لیے بہت کچھ ہے۔

اصول معاشیات کا تعارف از جناب ایس عبداللہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۷۲، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ادارۂ علمیہ، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ ۲۷۶۲۲۱۔

علم معاشیات کی اہمیت ہمیشہ رہی لیکن بحیثیت ایک فن کے یہ علم بھی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی طرح زیادہ متحرک اور منظم شکل میں سامنے آیا، اردو میں اس کے مبادی ومضامین پر کتاب کی ضرورت تھی، زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو بہترین انداز میں پورا کرتی ہے، موضوع، تعریف، صرف، افادیت، طلب، قیمت، مصارف، پیداوار، محنت، سرمایہ، زر، تبادلہ، بازار، پیداوار، آمدنی، تقسیم، لگان، مزدوری، سود، نفع جیسے موضوعات کے ساتھ ایک باب اسلامی مالیات عامہ کے عنوان سے بھی ہے، درسی ضرورت کے علاوہ بھی یہ عام مطالعہ کے لیے نفع بخش کتاب ہے، اس قابل قدر محنت کے لیے مصنف اور ادارہ دونوں لائق تحسین ہیں۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

الشیخ المحدث محمد یونس الجون فوری :الشیخ محمود حسن الحسنی الندوی، مترجم:عبدالرشید الندوی، مکتبہ الندویہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں

ادبی تحریریں: لئیق خاں کوثر، محلہ تھانہ پاکھڑ ڈیرہ، کمال زئی، ضلع رامپور۔ قیمت ۲۵۰ روپے

جمس آف جینئس: مولانا محمد ثناء اللہ عمری، ڈور نمبر ۲۱۔۵۵۳/۲۴، فرنچ پٹ، مچھلی پٹنم، ضلع کرشنا، آندھرا پردیش قیمت ۱۸۰ روپے

چند ممتاز مشائخ چشت: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، بیت الحکمت کریم الدین پور، گھوسی، مئو۔ قیمت دعائے خیر

حقائق عمر عائشہؓ: انیس احمد و ڈاکٹر جاوید احمد، مہتاب بک ڈپو، یک منارہ مسجد، تکیہ، اعظم گڑھ۔ قیمت ۱۲۰ روپے

شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری: (انگریزی) محمود حسن حسنی ندوی، ڈیرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی۔ قیمت درج نہیں

علامہ فضل حق خیرآبادی اور معاصر علما: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، بیت الحکمت کریم الدین پور، گھوسی، مئو۔ قیمت درج نہیں

محشر خیال: ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ قیمت ۲۵۲ روپے

مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن کے نام: محمد عتیق الرحمٰن، پرویز بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ قیمت ۲۵۰ روپے

نقوش طنز و مزاح: ڈاکٹر محمد قائم الاعظمی، امجدی کتب خانہ بلرام پور، قیمت ۲۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس ودبیر		250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
JANUARY 2021 Vol - 207 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	سیرالصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد مسعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفرالاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-